ناول ''آتش دان'' کا تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار

جاوید احمد شاہ

نگراں

ڈاکٹر عرشیہ جبین

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۴۶

جون ۔ ۲۰۱۶

فہرست

پیش لفظ: ۴۔۷

باب اول:

حیدرآباد کی چند اہم خواتین ناول نگار ۸۔۳۱

باب دوم:

قمر جمالی سوانح اور شخصیت ۳۲۔۶۶

باب سوم:

ناول ''آتش دان'' کا تنقیدی مطالعہ ۶۷۔۱۳۵

ماحصل: ۱۳۶۔۱۴۲

کتابیات: ۱۴۳۔۱۴۷

﴿پیش لفظ﴾

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلق کر کے اس کی سرشت میں علم ودیعت کر دیا اور اسی علم کی بدولت انسان کے فہم وادراک میں صحیح وغلط کی تمیز ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ کا بے حد حمد وثنا ہے جس نے مجھے علم کی راہ پر گامزن کیا اور پھر ادب کے شعبے کے ذریعے علم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔دور حاضر میں علم مختلف شعبوں میں تقسیم ہوا ہے مثلاً، منطق، اقتصادیات، قانون، معیشت، معاشرت اور ادب وغیرہ۔ادب کے ذریعے انسان اپنے جذبات واحساسات، فکر ونظریہ دوسروں تک پہنچا سکتا ہے جبکہ اقتصادیات، قانون اور منطق جیسے علمی شعبے اس سے عاری ہیں۔ادب کی کسوٹی کو پرکھنے کیلئے تنقید نگاری وجود میں آئی جسے فن پارے کے حسن کو تقویت ملتی ہے۔

افسانوی ادب سے میری دلچسپی زیادہ رہی ہے اس لئے میں نے اپنی نگراں ڈاکٹر عرشیہ جبیں صاحبہ کے ساتھ مشورہ کر کے عصر حاضر کی ابھرتی ہوئی فنکارہ قمر جمالی کے ناول ''آتش دان کا تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ یہ میری خوش بختی ہی ہے کہ یونی ورسٹی کے اساتذہ نے میری اس تجویز کو قبول کیا اور مجھے ناول ''آتش دان'' پر کام کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

موضوع کے طے پانے کے بعد میں مواد کی تلاش میں سرگرداں رہا۔اس سلسلے میں سب سے پہلے میں نے قمر جمالی سے رابطہ کیا۔انہوں نے مجھے مایوس کئے بغیر تمام وہ چیزیں دستیاب رکیں جو میرے تحقیقی مقالے کے لیے مفید ومددگار ثابت ہوئیں۔اس کے بعد میں نے یونیورسٹی آف حیدرآباد کی اندرا گاندھی میموریل لائبریری میں اپنے موضوع کے متعلق کتابیں اور رسائل تلاش کیئے۔

تمام مواد کو پڑھنے کے بعد میں نے اپنے مقالے کو تین ابواب میں منقسم کیا ہے۔

باب اول: جس کا عنوان حیدرآباد کی چند اہم خواتین ناول نگار ہیں۔اس باب میں حیدرآباد کی چند اہم خواتین ناول نگاروں کا مختصراً تعارف دیتے ہوئے ان کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم: یہ باب قمر جمالی کی حیات اور شخصیت سے متعلق ہے جس میں قمر جمالی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیسے ان کی ولادت، تعلیم و تربیت، ازدواجی زندگی، علمی خدمات، انعامات و اعزازات اور اس کے علاوہ ان کی شخصی خصوصیات کو بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم: جس کا عنوان ''ناول آتش دان کا تنقیدی مطالعہ'' ہے۔اس باب میں ناول ''آتش دان'' کو مختلف زاویئوں جیسے موضوع، قصہ، پلاٹ، کردار، منظر نگاری، جزئیات نگاری، جذبات نگاری، اسلوب، تکنیک، فلسفۂ حیات وغیرہ پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

آخر میں ماحصل دیا گیا ہے جس میں تمام ابواب کے اہم نکات کو پیش کرتے ہوئے نئے نتائج اخذ کر کے قمر جمالی کی فنی خصوصیات کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تحقیق کے سلسلے میں جن ذی شعور اشخاص اور اداروں کا تعاون مجھے حاصل ہوا ان کا شکریہ ادا کرنا میرے لئے فرض عین سے کم نہیں۔سب سے پہلے میں حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے مجھے تحقیقی میدان میں آنے کا موقع فراہم کیا۔

میں اپنی شفیق استاد اور نگراں کار محترمہ ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی سرپرستی میں اس تحقیق کا آغاز ہوا۔ساتھ ہی ساتھ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود انھوں نے نہ صرف

میرے تحقیقی کام کو جانچا بلکہ اس کی اصلاح بھی کی۔جس کے لیے میں صمیم قلب کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں صدر شعبہ اردو پروفیسر مظفر علی شہ میری صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ایم۔فل کے پہلے سمسٹر کے دوران ہم سب طالبِ علموں کو عمدہ ریسرچ کا طریقہ سکھایا جس کی بدولت اس مقالے کے اختتام تک مجھے کوئی پریشانی درپیش نہیں آئی اور شعبہ اردو کے باقی اساتذہ کا بھی شکریا ادا کرتا ہوں جنھوں نے تحقیق کے دوران نہ صرف مجھے اپنی قیمتی آرا سے نوازا بلکہ قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے شفیق استاد محترم ڈاکٹر پرویز احمد آعظمی صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں جن کا شفیق سائیہ ہمیشہ میرے سر پر رہا اور جن کی راست تربیت اور جذبہ خلوص کی تحریک نے مجھے ریسرچ کے لیے آمادہ کیا۔

میں قمر جمالی صاحبہ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے اس تحقیقی مقالے کے تئیں اپنا تعاون فراہم کیا اور مجھے وہ ہر ممکن مواد فراہم کیا جس کی ضرورت پیش آئی۔علی الخصوص انھوں نے اپنے تاثرات کے ذریعے اس مقالے میں محاسن بھر دیئے۔

میں اپنی یونیورسٹی کے تمام سینیر ریسرچ اسکالروں اور ہم جماعت ساتھیوں کا مشکور ہوں جنھوں نے دوران تحقیق میری مدد کی اور مجھے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

آخر میں اپنے شفیق والدین کا شکریہ ادا نہ کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جن کی دعاؤں سے

یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی چھوٹی بہنوں کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے گھریلو ں
ذمہ داریوں کو قبول کر کے مجھے ریسرچ کے لیے وقت فراہم کیا۔ اللہ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔

شکریہ!

جاوید احمد شاہ

(ایم۔اے، بی۔ایڈ)

باب اول

حیدرآباد کی چند اہم ناول نگار خواتین

تعارف:

شہر حیدرآباد اپنی بیش بہا خصوصیات کی بنا پر اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ ابتداء ہی سے یہ شہر اپنی منفرد زبان، تہذیب اور ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ بالخصوص اردو زبان و ادب کی اس شہر میں ہمیشہ ہی سر پرستی ہوتی رہی ہے۔ یہاں کی سرزمین اردو ادب کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ اردو ادب کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ حیدرآباد کے حکمرانوں کو اردو ادب سے کافی شگف اور لگاؤ تھا، وہ خود صاحب طرز شاعر و ادیب تھے اور ادیبوں کی سر پرستی ان کا شیوہ تھا۔ یہاں کی خاک سے بے شمار شعرا و ادبا نے جنم لیا، جنہوں نے ہر دور میں ادب کی آبیاری کی ہے اور اپنی علم دوستی اور دانشوارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے دنیا میں اپنے وطن کا نام روشن کیا ہے۔

عہد آصفیہ سے قبل ہندوستان کے لوگ قدیم روایات کے پابند تھے۔ خاص کر حیدرآباد کا ماحول عورتوں کے لیے سخت گیر تھا۔ اکثر گھرانوں کی خواتین گھر کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔ لیکن وقت کے ساتھ زمانہ بدلنے لگا اور قدامت پسندانہ ماحول میں تبدیلی آنے لگی۔ انیسویں صدی میں حیدرآباد میں تحریک نسواں کا آغاز ہوا، جس کا اثر معاشرتی اور تمدنی زندگی سے راست یا بلا واسطہ طور پر ضرور پڑا۔ اس تحریک کی وجہ سے خواتین کو ایک حوصلہ اور ہمت ملی، جس کی بدولت انھوں نے نہ صرف خود تعلیم حاصل کی بلکہ سماج میں روشن خیالی اور حصول علم کے رجحان کی تربیت کی۔ تحریک نسواں نے بہت سی خواتین نثر نگاروں کو پیدا کیا، جن میں جیلانی بانو، عفت موہانی، آمنہ ابوالحسن، رفیعہ منظور الامین وغیرہ نے اپنی کاوشوں سے اردو نثر کو بہت آگے لے جانے میں کوئی کثر

باقی نہیں چھوڑی ۔ ان نثر نگار خواتین نے اپنے فن پاروں کو کسی مخصوص موضوع تک محدود نہیں رکھا بلکہ تقریباً تمام موضوعات پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردوادب میں اپنی شناخت برقرار رکھی ہے ۔شاعری، افسانہ نگاری، تنقید، تدریس، ہر میدان میں خواتین دکن کی صلاحیتوں کے نقوش نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں ۔ چونکہ اس باب میں ہمیں حیدرآباد کی چند اہم ناول نگار خواتین کا احاطہ کرنا ہے۔اس لیے ہم صرف فکشن کے اسی زمرے کو موضوع بحث بنانے کی کوشش کریں گے۔

حیدرآباد کی خواتین ناول نگاروں نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں ناول لکھنے شروع کیے اور تب سے آج تک یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ کئی خاتون ناول نگار آج بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں ۔انھوں نے فن اور موضوع دونوں اعتبار سے اسے وسعت بخشی ہیں ۔ان ناول نگار خواتین نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے بنیادی مسائل کو جگہ دی ہے اور ناول کے ذریعہ عورتوں کی تعلیم وتربیت، سماجی واخلاقی اور معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ان کے نزدیک عورتوں کا ناخواندہ ہونا ہی تمام خامیوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔عورت اگر تعلیم یافتہ ہوگی تو کامیاب زندگی گزار سکے گی ۔اس کے علاوہ انھوں نے سماج کے فرسودہ رسم ورواج کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی ہے۔

حیدرآباد کی ناول نگار خواتین میں جیلانی بانو، عفت موہانی، واجدہ تبسم، آمنہ ابوالحسن، رفیعہ منظورالامین، فاطمہ تاج، صغرا ہمایوں مرزا، قمر جمالی بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ان ناول نگاروں کے یہاں ماحول کے مشاہدے کے ساتھ ساتھ غور وفکر کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں ۔اس ضمن میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ان کے یہاں صرف جذبات نگاری ہی نہیں ہے بلکہ فکر کی کارفرمائی بھی نظر آتی

ہے۔انھوں نے اپنی فکر اور شعور کی بدولت اپنی انفرادیت کو تسلیم کروانے کی کوشش کی ہے۔اپنے موضوعات کے ساتھ انہوں نے پورا انصاف کیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ ایسی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے،جن کے ذریعے نہ صرف اپنا نام پیدا کیا بلکہ ادبی دنیا میں بھی ایک خاص پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

جیلانی بانو

جیلانی بانو اردو کی مشہور و معروف فکشن نگار ہیں،انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج کے مختلف مسائل خصوصاً سرزمینِ حیدرآباد کی معاشرتی وسیاسی فضا،تہذیبی وثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔جیلانی بانو کی ولادت اتر پردیش کے شہر مردم خیز ضلع بدایوں میں ۱۴؍جولائی ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔جیلانی بانو کی پیدائش کے بارے میں ''مشرف علی'' اپنی کتاب ''جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ'' میں یوں لکھتے ہیں:

> ''جیلانی بانو کی پیدائش ۱۴؍جولائی ۱۹۳۶ء کو اتر پردیش کے شہر بدایوں میں ہوئی۔ان کے آبا واجداد ضلع بدایوں اتر پردیش کے رہنے والے تھے لیکن ان کے والد علامہ حیرت بدایونی نے ملازمت کے سلسلے میں مع اہل وعیال حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔یہی وجہ ہے کہ مصنفہ حیدرآباد کو ہی اپنا وطن قرار دیتی ہیں۔'' [1]

---

[1] مشرف علی، جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ،ص ۱۷

جیلانی بانو کے والد حیرت بدایونی عالم دین اور فارسی و اردو کے شاعر تھے۔ وہ اپنے بچوں کی پرورش، تعلیم وتربیت کی پوری نگہداشت رکھتے تھے۔ اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جیلانی بانو کی پرورش وتربیت خالص ادبی ماحول میں ہوئی، جس کا اثر ان کی بقیہ زندگی پر بھی گہرا پڑا اور اسی کی بدولت آج وہ اردو کی مشہور ومعروف فکشن نگار خیال کی جاتی ہیں۔

مصنفہ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ بچپن سے ہی ان کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا، جس کی وجہ سے کم عمری ہی میں انھوں نے صاحب طرز ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ کیا۔ مطالعے کے شوق اور گھر کے ادبی ماحول نے ان کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں مدد کی۔ جیلانی بانو کی تعلیم کے سلسلے میں مشرف علی یوں رقم طراز ہیں:

> ''جیلانی بانو نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی انھوں نے ایم۔اے اردو تک کی تعلیم حاصل کی ہے۔ لیکن زیادہ تر امتحانات انھوں نے پرائیویٹ ہی پاس کیے۔ وہ باضابطہ اسکول یا کالج نہیں گئیں۔'' [۱]

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہر ادیب اپنے عہد سے متاثر ہوتا ہے۔ جیلانی بانو نے جس عہد میں ہوش سنبھالا وہ جاگیردارانہ ماحول ومعاشرے کی ٹوٹتی بکھرتی روایتوں اور قدروں، سیاسی وسماجی تغیرات اور تحریک آزادی کا دور تھا۔ اس دور کے حالات ومسائل نے ان کے حساس ذہن کو متاثر کیا۔ اور جب انھوں نے قلم اٹھایا تو اپنی تمام فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔

---

[۱] مشرف علی، جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ، ص ۱۸

انسانی زندگی کے نشیب وفراز اور دیگر سیاسی، سماجی مسائل کو کہانیوں کے پیرائے میں ڈھال دیا۔ان کی تخلیقات میں حقیقت پسندی اور سیاسی وسماجی شعور کی پختگی کا بھر پور اظہار ملتا ہے۔

جیلانی بانو نے نثر کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے اپنا تخلیقی سفر ملک کی آزادی کے بعد شروع کیا۔ان کی پہلی کہانی کا نام ''موم کی مریم'' ہے جو کہ ادب لطیف لاہور کے سالنامے میں شائع ہوئی تھی۔اس کے بعد ان کا قلم بلا کسی تردد کے چل پڑا۔انھوں نے افسانہ وناول نگاری کے ساتھ ساتھ کتابوں پر تبصرے بھی کیے ہیں۔روزنامہ سیاست میں کالم ''شیشہ وتیشہ'' بھی لکھا ہے۔مختلف اخبارات ورسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔

جیلانی بانو کے دو مشہور ناول ''ایوان غزل'' اور ''بارش سنگ'' ہیں۔ان کا پہلا ناول ''ایوان غزل'' ہے، جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔اس ناول کا نام پہلے ''عہد ستم'' تھا لیکن اس وقت ایمرجنسی کی وجہ سے کتابوں پر سنسر شپ عائد تھی اور یہ نام چونکہ قابل اعتراض تھا لہذا اس کا نام بدلنا پڑا۔یہ ناول آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد تک کے چند برسوں کی حیدرآبادی ثقافت وتہذیب کی حقیقی عکاسی کرتا ہے۔اس ناول میں ریاست حیدرآباد کے زوال پزیر جاگیر دارانہ معاشرے میں پیدا شدہ حالات ومسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔''ایوان غزل'' دراصل ایک تہذیبی اور سماجی ناول ہے، جس میں ریاست حیدرآباد کے زوال کی داستان پیش کی گئی ہے۔جیلانی بانو نے ''ایوان غزل'' لکھ کر اردو ناولوں کی فہرست میں ایک اچھے ناول کا اضافہ کیا۔آج اس ناول کا شمار اردو کے پسندیدہ ناولوں میں کیا جاتا ہے۔

ایوان غزل میں اس عہد کی بہترین انداز میں ترجمانی کی گئی ہے۔ایوان غزل کے موضوع

کے بارے میں مشرف علی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''اس ناول میں زوال خوردہ جاگیردارانہ نظام سے پیدا شدہ حالات وحقائق کو یکجا کر کے انھوں نے اس معاشرے کی کھوکھلی روایات اور اقدار کو بے نقاب کیا ہے۔ جہاں عورتوں کے حالات ومسائل، ضعیف الاعتقادی، مذہبی ریاکاری، فرسودہ رسم ورواج، مشترکہ تہذیب وکلچر، نئی اور پرانی تہذیبوں میں کشمکش، مظلوموں اور کسانوں کا استحصال، استحصالی نظام کے بطن سے پیدا ہونے والی نئی قوتیں اور ان کی مسلح بغاوت کی حقیقی عکاسی کی گئی ہے''۔ [1]

ایوان غزل میں عورتوں کی سماجی حیثیت اوران کے حالات ومسائل کو مرکزی موضوع بنایا گیا ہے۔اس ناول میں جاگیردارانہ معاشرے میں اعلیٰ اور نچلے طبقے کی عورتوں کی زندگی اور ان کے حالات ومسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس سے نہ صرف اس عہد ونظام میں ان کی سماجی حیثیت اور مسائل کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ عورتوں کی نفسیات، جذبات واحساسات کی ذہنی گھٹن کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اس ناول کی ہیروئن ''غزل'' ہے جو ایک اہم ترین کردار ہے۔غزل بچپن میں اسٹیج پر اداکارہ کے طور کام کرتی ہے۔غزل کی زندگی میں کئی مرد آتے ہیں اور ہر دفعہ وہ دھوکہ دہی کا شکار ہوتی ہے، جس کے سبب ان کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔واحد حسین، ارشد حسین، رضیہ، نصیر، کرانتی

---

[1] مشرف علی، جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ، ص۳۴

وغیرہ اس ناول کے اہم کردار ہیں۔اس پورے ناول میں مصنفہ نے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کسی نہ کسی طرح استحصال کا شکار ہوتی ہے،اس وجہ سے اس میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اس ناول میں دکھایا گیا ہے۔ایوانِ غزل کی زبان رواں دواں ،سادہ، برجستہ اور برمحل ہے۔ زبان و بیان میں ہمواری اور ادبی شان پائی جاتی ہے۔جیلانی بانو کو زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ایک منفرد اسلوب کی مالک نظر آتی ہیں۔دکنی زبان کا برمحل اور برجستہ استعمال ان کی زبان و بیان کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔الغرض ایوانِ غزل فکری اور فنی اعتبار سے ایک اہم ناول ہے اور اس کا کینوس حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول و معاشرے کا احاطہ کرتا ہے اور اپنے تاریخی موضوع ،مصنفہ کی تخلیقی صلاحیت ،فنی مہارت اور فکر و فن کے حسین امتزاج کے باعث اردو کا شاہ کار ناول کہا جا سکتا ہے۔

جیلانی بانو کا دوسرا ناول ''بارش سنگ'' ۱۹۸۴ء کراچی پاکستان سے اور ۱۹۸۵ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔بارش سنگ کا سب سے پہلے مراٹھی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے رسالے ''پنچ دھارا'' میں اسے قسط وار شائع کیا گیا۔بارش سنگ کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا اور hail of sterness کے نام سے دہلی سے شائع کیا گیا ہے۔''پتھروں کی بارش'' کے نام سے اس کا ترجمہ ہندی میں ۱۹۸۷ء میں دہلی سے شائع کیا گیا۔''بارش سنگ'' تلنگانہ کے کسان تحریک کے پس منظر میں تصنیف کیا گیا ہے ،جس میں آزادی سے قبل اور آزادی کے چند برسوں بعد تک حیدرآباد کے رہنے والے دیہی علاقوں کے غریب کسانوں ،مزدوروں اور عورتوں کے حالات و مسائل کی حقیقی عکاسی کی گئی ہے۔جاگیردارانہ نظام کا ظلم و ستم ،معاشی استحصال ،سماجی غیر

برابری اور طبقاتی کشمکش اس ناول میں پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ بارش سنگ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا قانون صرف بڑے لوگوں کے مفادات پورے کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے اور غریب عوام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

''بارش سنگ'' میں کردار نگاری اپنے عروج پر ہے۔ جیلانی بانو نے تقریباً ڈھائی سو صفحات کے اس ناول میں متعدد کردار پیش کیے ہیں، جن میں اول تا آخر آدرش کی جنگ جاری رہتی ہے۔ ان کرداروں میں احمد بی، رتنا اور مالن بی ایسی خواتین ہیں، جن کی زندگی حالات کے دھارے پر بہتی ہے اور وہ خود سے اس کو بدلنے کی استطاعت نہیں رکھتیں۔ شب و روز ساہوکاروں کی غلامی کرنے والے مرد بھی ہیں، جن کی کوئی عزت نہیں، کوئی وقار نہیں۔ نرسیا اور بشیر علی جیسے سر پھرے دہشت پسند انقلابی نوجوان بھی ہیں اور خواجہ بی ایسی مجبور اور بے نوا مائیں بھی جو اپنے بچوں سمیت کوئیں میں کود کر جان دے دیتی ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ''بارش سنگ'' ایک منفرد ناول ہے، جس میں جیلانی بانو نے حیدرآباد کی مخصوص زبان اور لہجے کو پیش کیا ہے۔ دیہی اور شہری زندگی کے کرداروں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ الغرض بارش سنگ ایوان غزل کی طرح فنی اعتبار سے کامیاب ناول ہے، جس میں موضوعات اور مسائل کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے جو قاری کو پڑھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔

جیلانی بانو کے ناولٹ کا مجموعہ ''جگنو اور ستارے'' ۱۹۶۵ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ مجموعے میں تین ناول 'دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پر'، 'جگنو اور ستارے'، 'رات' شامل ہیں۔ جیلانی بانو کے ایک اور ناولٹ کا مجموعہ ''نغمے کا سفر'' ۱۹۷۷ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کا

انتساب جیلانی بانو نے اپنے شوہر ڈاکٹر انور معظم کے نام معنون کیا ہے ۔مجموعے میں چار ناولٹ شامل ہیں۔ا۔اکیلا ۲۔پتھر کا جگر ۳۔کیمیائے دل اور ۴۔نغمے کا سفر۔

رفیعہ منظورالامین

رفیعہ منظورالامین حیدرآباد کی ایک مشہور ومعروف فکشن رائٹر ہیں۔ان کی ولادت حیدرآباد کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ابتدامیں ان کی تعلیم کاچی گوڑہ، حیدرآباد کے ایک اسکول میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے کاچی گوڑہ سے ہی میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اپنا تعلیمی سفر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے B.Sc ویمینز کالج، کوٹی، حیدرآباد سے کیا۔

رفیعہ منظورالامین کے پردادا کا نام پیارے صاحب عزیز تھا، جنھوں نے سکندرآباد میں ایک اسلامیہ اسکول قائم کیا تھا، جس میں لڑکیوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔آج بھی وہاں درس وتدریس کا کام انجام دیا جارہا ہے۔ان کے دادا کا نام عبدالمجید تھا جو حیدرآباد سول سروسز کے ممبر تھے۔ساتھ ہی ساتھ انہیں انسپکٹر جنرل کا عہدہ بھی حاصل ہوا تھا۔اس کے علاوہ عبدالمجید اکاؤنٹنٹ جنرل کے باوقار عہدے پر بھی سرفراز ہوئے تھے۔رفیعہ منظورالامین کے والد محترم کا نام عبدالحمید تھا جو محکمۂ پولیس میں ایک پر وقار عہدے پر فائز تھے۔اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ رفیعہ منظورالامین ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کا خاندان ایک اعلیٰ اور علمی خاندان ہے، جس کا اثر رفیعہ منظورالامین پر بھی پڑا ہوگا۔رفیعہ منظورالامین کی شادی منظورالامین سے ہوئی ہے، جس کے سبب انھوں نے شوہر کے نام کو اپنے نام کا جز بنالیا۔منظورالامین بذات خود ایک شاعر وادیب ہیں، انھوں نے نظمیں، افسانے، مضامین، ڈرامے اور میوزیکل فیچر لکھے ہیں۔اس کے علاوہ طنزومزاح پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔وہ آل

انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنو پر بحیثیت ڈائرکٹر فائز رہے ہیں، ٹیلی ویژن کے شعبے سے منسلک رہتے ہوئے کئی ترقیاں حاصل کیں اور آخر میں ڈائرکٹر جنرل دوردرشن نئی دہلی کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے وظیفہ حسن خدمت سے سبکدوش ہوئے۔

رفیعہ منظورالامین کو بچپن ہی سے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔انھوں نے پہلی کہانی آٹھ سال کی عمر میں لکھی تھی جو دہلی سے شائع ہونے والے رسالے ''پیام تعلیم'' میں شائع ہوئی تھی۔کالج میں بھی وہ ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔کالج میگزین ''کا سماس'' کی ادارت کے فرائض بھی انہوں نے انجام دیے۔مصنفہ کی جو تخلیقات منظر عام پر آئیں ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

ناول:ا۔سارے جہاں کا درد۱۹۷۴ء، عالم پناہ۱۹۸۳ء، یہ راستے 1995ء۔

افسانہ: دستک سی درد دل پر ۱۹۸۶ء، آہنگ ۲۰۰۰ ء۔اس کے علاوہ مصنفہ نے بارہ ٹیلی فلمیں لکھی ہیں جو دوردرشن کے نیشنل چینل کے علاوہ سری نگر، جالندھر، لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد کے دوردرشن کیندروں سے پیش کی جا چکی ہیں۔

ان کا پہلا ناول ''سارے جہاں کا درد'' پہلی بار۱۹۷۴ء میں اور اسکے دس سال بعد دوبارہ ۱۹۸۴ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔یہ ناول۳۴۳صفحات پر مشتمل ہے۔''عالم پناہ'' مصنفہ کا دوسرا ناول ہے۔اس ناول کے تین اڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ناول کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی ہے۔''عالم پناہ'' کا ہندی زبان کے علاوہ کنڑ میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ہندی میں ناول کا ترجمہ منظورالامین نے کیا ہے۔مصنفہ نے اس ناول کا انتساب اپنے شریک حیات منظورالامین کے نام کرتے ہوئے لکھا ہے:

''منظورالامین کے نام جس کے ساتھ حیات، حیات جاوداں بن گئی''

یہ ناول ۱۹۸۳ء میں دہلی سے اور ۱۹۸۷ء میں حسامی بک ڈپو حیدرآباد سے شائع ہوا۔ یہ ناول اتنا مقبول ہوا کہ اس کو آل انڈیا ریڈیو کے قومی پروگراموں میں ریڈیائی سیریل کے طور پر اٹھارہ قسطوں میں نشر کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ''فرمان'' کے نام سے دوردرشن کے چینل نمبرا اور ۲ پر کم از کم چھ بار پیش ہو چکا ہے۔ موصوفہ کا تیسرا ناول ''یہ راستے'' ۱۹۹۵ء میں انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش، اردو حال، حمایت نگر، حیدرآباد سے چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔ موصوفہ نے اس ناول کا انتساب اس طرح پیش کیا ہے:

''ان ساری لڑکیوں کے نام جنہیں اس قابل نہیں بنایا جاتا کہ ان میں خوداعتمادی پیدا ہو''۔

مجموعی اعتبار سے رفیعہ منظورالامین کی حیثیت اردو ادب میں بلند اور مستحکم ہے۔ ان کی شخصیت ان کے فن پاروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے فن پاروں میں فرضی کرداروں سے ایک حد تک گریز کیا ہے۔ موصوفہ نے حقیقی واقعات سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کے گہرے اور عمیق تجربات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی کہانیوں کا تانا بانا بنا ہے۔

عفت موہانی

عفت موہانی کا نام اردو دنیا میں ایک فکشن نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ وہ حیدرآباد کی صف اول کے ناول نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ عفت موہانی کا اصل نام خورشید سلطانہ ہے لیکن ادبی حلقوں میں وہ عفت موہانی کے نام ہی سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ ان کی ولادت ۲۴/ جولائی

۱۹۳۷ء میں حیدرآباد میں ہوئی تھی اور ۱۶/ نومبر ۲۰۰۵ءکو وہ اس دنیا کو خیرآباد کہہ گئیں ۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ۔اے ۔ایم اے اور بی ۔ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں ۔موصوفہ کی حیات وخدمات پر عثمانیہ یونیورسٹی سے۲۰۰۴ء میں پروفیسر بیگ احساس کی نگرانی میں ایک خاتون ایم فل بھی کرچکی ہیں ۔مصنفہ کافی زودنویس تھیں ۔انھوں نے تقریباً ۱۷۰۰ افسانے اور ۸۴ ناول لکھے ہیں ۔ان کے اکثر وبیشتر ناول نسیم بک ڈپو،لکھنؤ سے شائع ہوئے ہیں ۔ان کے ناولوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ستم کے سہارے۲۔محبت نام غم کا۳۔درود درماں۴۔قافلے بہار کے۵۔نام تمنا۶۔ بزدل ۷۔غمگسار ۸۔ہمسفر ۹۔ پندار۱۰۔راز ۱۱۔آخری تحفہ ۱۲۔محبت کی راہیں ۱۳۔صنم۱۴۔داغ دل ۱۵۔شہرآرزو ۱۶۔آہوں کے گیت ۱۷۔مداو ۱۸۔بندھن ۱۹۔سویرے۲۰۔پیاں ۲۱ ۔سزا ۲۲۔بھنور۲۳۔لے نام بھی آہستہ۲۴۔فاصلے اورمنزل ۲۵۔درد کارشتہ ۲۶۔ایک چراغ دورکا ۲۷۔ صہبا ۲۸۔زودپشیماں ۲۹۔پھول کادل ۳۰۔شرارت ۳۱۔وفا کادکھ۳۲۔ہم جئے بس تیرے لیے۳۳۔تقدیر ۳۴پرانی آگ۳۵۔بہانے ۳۶ انتظار ۳۷۔ایک زخم نہاں اور۳۸۔آگ میں پھول ۳۹۔تیرے جہاں سے چل دیے۴۰۔پت جھڑ کی بہار ۴۱۔آرزو کی سوغات۴۲۔نغمۂ سنگ ۴۳۔ دوراہا ۴۴ ۔خواب وسراب ۴۵۔ پیاسی برسات ۴۶ ۔قلزم غم ۴۷۔خلش ۴۸۔تکریم ۴۹۔پچھتاوے ۵۰۔دردآشنا ۵۱۔ایک نظر ۵۲۔آفریں ۵۳۔چبھن۵۴۔شرط۵۵۔تشنہ کام ۵۶۔خواب پریشاں۵۷۔موم کی زنجیریں ۵۸۔گنہگار ۵۹۔ہارجیت۶۰۔بے زبان۶۱۔نقاب ۶۲۔تاوان۶۳۔محبت تم سے کی میں نے ۶۴۔بنیا ۶۵۔صنوبیہ۶۶۔تعبیر ۶۷۔راستہ پھولوں بھرا

۶۸۔خمیازہ۶۹۔دلیل کا کنول۷۰۔صبح بہاراں ۷۱۔لبینہ ۷۲۔اگرتم باوفا ہوتے ۷۳۔سراب ساحل ۔۷۴۔خواب ناتمام۷۵۔کرنوں کی مہک۷۶۔ماریہ۷۷۔وفا جن سے کی ۷۸۔اگن برہا کی ۷۹۔سحاب۸۰۔رقیب ۸۱۔وہ ایک لمحہ ۸۲۔خوشبو تیری یادوں کی۸۳۔شفق کے سائے ۸۴۔ملن کے سپنے۔

عفت موہانی کے مندرجہ بالا ناولوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ انہوں نے ناول نگاری کی روایت کو اردو میں توانائی بخشی ۔ناول نگاری جو کہ ایک بڑا کینوس رکھتا ہے، اس کے لیے وقت، مشاہدۂ حالات، افکار، ترتیب، پیش کش، کلائمکس، کرداروں کی بھرمار، پورے معاشرے کی عکاسی کرنے کا فن کسی معمولی فن کار کے بس کا کام نہیں ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اشاعت کے مراحل اوراس سے پیدا ہونے والی صورت حال سے نمٹنا، پورے معاشرے کی عکاسی کا احاطہ کرنا، مختلف کرداروں کی نفسیات اوراحساسات کو پیش کرنا ایک بڑی بات ہے۔اس تناظر میں اگر ہم عفت موہانی کی بات کریں تو انہوں نے ان تمام چیزوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو ناول کو بہت آگے لے جانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ناول کے فن کو انھوں نے بڑی باریکی سے جانچا ہے اوراپنے ناولوں میں باریک سے باریک پہلو پر بے باکانہ اظہار بھی کیا ہے۔عفت موہانی نے اپنی تخلیقات میں ہرطرح کے موضوعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔خواہ وہ اخلاقی ہوں، سماجی ہوں، اصلاحی ہوں یا پھر معاشرتی، ان تمام موضوعات کو فن پارے کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔

واجدہ تبسم

واجدہ تبسم اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے۔ برصغیر کی یہ نامور شخصیت امراوتی میں ۱۶/ مارچ ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئی۔ ادبیات اردو میں جامعہ عثمانیہ سے ماسٹرز ڈگری حاصل کی۔ بعد میں کچھ ایسے حالات بنے کہ انھیں اپنے اہل خانہ کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد دکن میں مستقل قیام کرنا پڑا۔ اپنے خاندان کی پرواہ کیے بغیر اپنی ذاتی پسند سے ۱۹۶۰ء میں انہوں نے اشفاق احمد خان سے شادی کر لی۔ دونوں شادی کے بعد تقسیم ہو گئے اور ۹/ دسمبر ۲۰۱۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

حیدرآباد کا دکنی لہجہ جو کہ دیگر صوبوں کی اردو سے قدر مختلف ہے، ان کی کہانیوں اور افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ دکنی زبان کے محاورے، ضرب الامثال کو انہوں نے بڑی چابک دستی سے استعمال کیا ہے۔ سرزمین دکن کی قدیم داستانوں، بودو باش اور رسوم کو انھوں نے اپنی تخلیقات میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

واجدہ تبسم کے ادبی سفر کا آغاز افسانے سے ہوا تھا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''شجر ممنوعہ'' ہے۔ آگے چل کر انہوں نے ناول نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنے مخصوص اسلوب کی وجہ سے خوب شہرت حاصل کی۔ ''کیسے کاٹوں رین اندھیری'' اور ''نتھ کی عزت'' ان کے دو مشہور ناول ہیں، جن میں موصوفہ نے حیدرآباد دکن کی خاص مسلم تہذیب کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ واجدہ تبسم کے ناولوں کا ایک مرکزی موضوع طوائف رہا ہے۔ حیدرآبادی معاشرت میں طوائف کا کردار اس کی زندگی کے نشیب وفراز، اس کی خوشیاں، اس کے غم، اس کی خواہشیں اور گھریلو زندگی پر اس کے اثرات کا تجزیہ بڑی خوبی کے ساتھ واجدہ تبسم نے اپنے ناولوں میں پیش کیا

ہے۔''نتھ کی عزت''اگر چہ ایک مختصر ناول ہے لیکن اس میں''حیا'' نامی طوائف کے جذبات واحساسات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ واجدہ تبسم نے انتہائی مہارت اور چابک دستی سے اس کا کردار تشکیل کیا ہے۔

''کیسے کاٹوں رین اندھیری'' بھی حیدرآبادی ماحول پر لکھا گیا ایک دلچسپ اور عبرت آموز المیہ ناول ہے۔اس ناول میں مصنفہ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ کس طرح طوائفوں کے پیچھے ہنستے بستے گھر برباد ہوجاتے ہیں۔حیدرآباد کی سماجی زندگی میں طوائف کے ناسور نے جو تباہیاں مچا رکھی تھیں، ان کا بیان ہی دراصل''کیسے کاٹوں رین اندھیری'' کا موضوع ہے۔اس وجہ سے یہ ناول ایک اصلاحی کتاب ہے، جسے ناول کے پیرائے میں لکھ کر مصنفہ نے ایک قابل قدر خدمت سر انجام دی ہے۔واجدہ تبسم کے ناولوں کی زبان اور اسلوب عام فہم ہے۔مشکل الفاظ سے وہ اجتناب کرتی ہیں۔واجدہ تبسم کے اسلوب کے بارے میں ڈاکٹر سید جاوید اختر یوں لکھتے ہیں:

> ''واجدہ تبسم کا اسلوب نگارش بے حد دل پزیر اور موثر ہے۔چھوٹے چھوٹے اور سادہ جملوں سے وہ اپنی عبارت میں سبک خرام ندی کی سی روانی پیدا کرتی ہے۔حیدرآباد کی روزمرہ بول چال،ان کی انشا کی خاص پہچان ہے۔ہر کردار اپنے ماحول،علم اور مرتبے کے مطابق بولتا ہے۔جذبات کے بےساختہ اظہار میں انہیں ملکہ حاصل ہے'' [1]

---

[1] ڈاکٹر سید جاوید اختر،اردو کی ناول نگار خواتین،دہلی۲۰۰۴،ص ۱۷۷

واجدہ تبسم نے اپنے ناولوں میں طوائفوں کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔طوائفوں کی زندگی کی پیش کش کے سبب جنسیات کی باتیں بھی ناول میں در آئی ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سید جاوید اختر لکھتے ہیں:

''واجدہ کی خاص وجہ شہرت عصمت چغتائی کی طرح ان کی بے باک اور کھلے انداز کی تحریر ہے۔مرد اور عورت کے جذباتی مراسم کو ـــــــ وہ رومانویت کے زاویے سے دیکھنے کے بجائے خالصتاً ''حقیقت پسندی'' کی نظر سے دیکھتی ہیں۔اور ان کے ماجروں میں جب کبھی مرد اور عورت کے جنسی معاملات کا ذکر آجاتا ہے وہ شرمانے کے بجائے مردوں کی طرح ـــــ بلکہ مردوں سے بھی بڑھ کر ـــــــ انتہائی جرأت مندی کے ساتھ اس کا بے دھڑک بیان کر دیتی ہیں۔'' [1]

منظر کشی کے فن پر بھی موصوفہ کو کامل عبور حاصل ہے۔واقعات کی سچی تصویر کشی ان کو بخوبی آتی ہے۔انھوں نے جس واقعہ، جس منظر کا نقشہ اپنی تخلیقات میں کھینچا ہے، وہ منظر یا واقعہ بالکل ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔اس ضمن میں سید جاوید اختر اپنی کتاب ''اردو کی ناول نگار خواتین ''میں یوں لکھتے ہیں:

''واجدہ تبسم کسی بھی تفصیل طلب معاملے کی یوں صراحت کرتی ہیں کہ

---

[1] ڈاکٹر سید جاوید اختر، اردو کی ناول نگار خواتین، دہلی ۲۰۰۴، ص ۱۷۸

پورا ماحول یا واقعہ ایک متحرک تصویر کے مانند آنکھوں کے سامنے گھوم
جاتا ہے'' [1]

صغرا ہمایوں مرزا

اردو دنیا میں صغرا ہمایوں مرزا ایک ادیبہ، شاعرہ، مدیرہ اور سماجی خدمت گزار کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔صغرا ہمایوں مرزا کے والد کا نام ڈاکٹر صفدر علی مرزا تھا۔بیگم صغرا ہمایوں کی ولادت ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد میں ہوئی اور ۱۹۵۹ء میں حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔ان کی شادی ۱۹۰۱ء میں ہمایوں مرزا صاحب سے ہوئی۔شادی کے بعد دونوں نے حیدرآباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔حیدرآباد میں رہ کر انہوں نے بہت سے فلاحی کام انجام دیے۔لڑکیوں کی فلاح و بہبود کے خیال سے انہوں نے ایک مدرسہ صفدریہ قائم کیا،جس کے لیے موصوفہ نے اپنی جائداد کا ایک حصہ وقف کر دیا۔اس مدرسے میں آج بھی تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف پیشہ ورانہ کورسز سکھائے جاتے ہیں۔صغرا ہمایوں مرزا نے نہ صرف فلاحی کام انجام دیے بلکہ اپنے قلم کے ذریعے سماج کی اصلاح کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

مصنفہ کا شمار اردو کی اولین خواتین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے ناول نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کی ہے اور انھیں اچھی شاعرہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔انہوں نے تقریباً چودہ ناول

---

[1] ڈاکٹر سید جاوید اختر، اردو کی ناول نگار خواتین، دہلی ۲۰۰۴،ص ۱۷۸

لکھے ہیں،جن میں ''تحریرالنساء''، ''موہنی''، ''مشیرنسواں''، ''زہرہ'' اور ''سرگزشت ہاجرہ'' بہت مقبول ہوئے ۔ خاص طور پر موٴخرالذکرناول نے بہت شہرت پائی۔صغرا ہمایوں مرزا نے اپنی تمام تحریروں میں خواتین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی اچھی تربیت پر بھی زور دیا ہے،جس کا اندازہ ان کے ناول ''سرگزشت ہاجرہ'' سے صاف صاف ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ''سرگزشت ہاجرہ'' کی ہیروئن کو اگر ہم لیں تو ناول پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ وہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کی شادی حیدرآباد کے ایک ایسے امیر خاندان میں ہوتی ہے جو شراب اور عیش وعشرت کا دلدادہ ہے مگر ہاجرہ اس ماحول میں بھی اپنی قابل تعریف تربیت کی وجہ سے نہ صرف اپنا مقام پیدا کرتی ہے بلکہ اس ناخوشگوار فضا ہی کو بدل ڈالتی ہے۔ وہ دنیادار لوگوں کو دین کی طرف مائل کرتی ہے۔مزید بر آں اس کی تین سہیلیاں جو اسی قسم کی مشکلات سے دوچار تھیں، اس کے مشوروں سے اپنے اپنے گھروں کے حالات سنوارتی ہیں۔مصنفہ نے ہیروین کے شب و روز کا ایک ٹائم ٹیبل بھی درج کیا ہے۔جس سے اس کی تربیت اور زندگی کے دستورالعمل کی پابندی کا پتہ چلتا ہے۔

''مشیرنسواں'' بھی ایک معاشرتی ناول ہے۔اس ناول میں اخلاقی اصلاح اور مقصدیت کار فرماں ہے۔''موہنی'' بھی اسی قبیل کے ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔بیگم صغرا ہمایوں مرزا کی تحریروں میں عموماً بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔اپنے عہد میں ان کی تخلیقات کافی مقبول ہوئیں۔عوام اور خواص دونوں طبقوں میں مصنفہ کی تخلیقات بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں۔ان کے فن پاروں میں اس عہد کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں،جس کی بدولت اس عہد کی روایات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ان کی تخلیقات میں مذہبی اور اصلاحی رنگ جھلکتا

ہے، جس کی وجہ سے ان کی تخلیقات پراثر اور نا قابل فراموش ثابت ہوئی ہیں۔

فاطمہ تاج

فاطمہ تاج حیدرآباد دکن کی ادب خیز سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں۔ حیدرآباد کی ان باشعور خواتین میں سے ایک ہیں، جنھوں نے ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ جیسے غزل، نظم، افسانہ، ناول، انشائیہ، خاکہ وغیرہ۔ فاطمہ تاج کی ولادت حیدرآباد میں ۲۵/اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ہوئی۔ ان کے آباواجداد مدینہ منورہ سے ہندوستان آکر آباد ہوئے۔ مصنفہ کی پیدائش اور خاندان کے بارے میں ڈاکٹر سید بشیر احمد لکھتے ہیں:

> ''فاطمہ تاج ۲۵/اکٹوبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید جمال الیل مدنی مدینہ منورہ کے سادات گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عربی کے قصیدہ گو شاعر تھے۔'' [1]

فاطمہ تاج کے والدین باشعور اور ذی علم شخصیتیں تھیں۔ ان کے والد صاحب خود شاعر تھے، جس کا اثر مصنفہ کی زندگی پر بھی گہرا پڑا اور بچپن ہی میں انہیں شعر گوئی اور کہانی لکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ ۱۹۹۲ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''اب کے برس'' چھپ کر شائع ہوا۔

فاطمہ تاج کی شادی یکم نومبر ۱۹۶۲ء کو حبیب احمد سے ہوئی۔ حبیب احمد اور فاطمہ تاج کے دس بچے ہوئے، جن میں چھ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ فاطمہ تاج کی شخصیت بہت پہلودار ہے۔

---

[1] سید بشیر احمد، سخنورانِ حیدرآباد، حیدرآباد میں اردو شاعری آزادی کے بعد، دہلی ۲۰۰۷

بحثیت ایک انسان وہ کئی خوبیوں کی ملکہ ہیں۔موصوفہ میں خیالات کی بلندی، اسلوب بیان کی صفائی اور پاکیزگی ، لطافت اور رنگینی سب کچھ موجود ہے۔ فاطمہ تاج مختلف تنظیموں سے بھی وابستہ رہی ہیں۔ All India Woman Assosation کی جنرل سکریٹری بھی رہ چکی ہیں۔ انجمن خواتین، بزم خواتین، تنظیم نسواں، تعمیر ملت، مسلم ایجوکیشن کی بھی ممبر ہیں۔فاطمہ تاج کی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے آل انڈیا میرا کیڈیمی نے انہیں ''امتیاز میر'' ایواڑ سے بھی نوازا ہے۔

فاطمہ تاج کے دوناول ''جب شام ہوگئی'' اور ''نقش آب'' اور ایک ناولٹ ''وہ'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔''وہ'' مصنفہ کا ایک مختصر ناولٹ ہے جو زیور طباعت سے ۵/نومبر ۱۹۹۵ء کو منظر عام پر آیا۔ یہ ناولٹ ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اس ناولٹ کی خوبی یہ ہے کہ ''وہ'' اور ''میں'' کی تمام گفتگو کو قلم بند کیا گیا ہے۔''وہ'' اور ''میں'' کا نام آخر تک تجسس میں رکھا گیا ہے۔فاطمہ تاج ناولٹ ''وہ'' کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''افسانوی دنیا میں زیادہ تر کردار فرضی ہی ہوتے ہیں اس کے باوجود لگتا ہے کہ ''وہ'' حقیقی کردار ہیں اور ہمارے آس پاس ہی ہیں ______ میں نے کوشش تو کی ہے کہ مرکزی کردار کو قارئین کے ذہن میں کہیں پناہ مل جائے۔''وہ'' دراصل '' میں'' کی نشاندہی کرتا ہے اور لفظ '' میں'' کائنات پر محیط نہیں بلکہ کائنات کی تخلیق کا سبب بھی ہے۔''وہ'' پورے ناول میں ''وہ'' ہی ہے اس سفر میں کہیں اس کا نام نہیں صرف اس کی گفتگو اور دوسرے کردار سے اس کا اتفاقی ٹکراؤ۔خوشگوار اور فکر ونظر سے بھر پور گفتگو میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں، میں کامیاب ہوسکی یا

نہیں؟ یہ فیصلہ قارئین ہی کر سکیں گے۔ ''میں'' کی اہمیت کے لیے ''وہ'' بہت ضروری ہے اور ''وہ'' کی اہمیت کو میں نے دیانت داری سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''وہ'' کا پر اثر اس کہانی کے اختتام پر ہی وضاحت کی منزلیں طئے کرتا ہے۔'' [1]

الغرض فاطمہ تاج اپنی پر کشش تحریر سے اپنے احساسات، جذبات، تجربات و مشاہدات سب کچھ صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتی ہیں۔ وہ خلوص کی پیکر ہیں، ان کی طبیعت میں سادگی ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ فاطمہ تاج اچھی ناول نگار ہیں۔ ان میں بات کہنے کا سلیقہ موجود ہے۔ انہوں نے تقریباً تمام موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا یہ وصف ان کے شعور اور فن کا آئینہ دار ہے۔ فاطمہ تاج ہر لحاظ سے قابل قدر اور لائق ستائش ہیں۔

آمنہ ابوالحسن

حیدرآباد کی فکشن نگار خواتین میں آمنہ ابوالحسن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سید آمنہ ابوالحسن جو آمنہ ابوالحسن کے نام سے ادبی دنیا میں جانی جاتی ہیں، حیدرآباد کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ۱۰ رمئی ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئیں۔ آپ کے نانا اپنے وقت کے جید عالم تصور کیے جاتے تھے۔ آمنہ ابوالحسن کے والد کا نام ابوالحسن سید علی تھا۔ آمنہ ابوالحسن کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن ہی میں ہو گیا

---

[1] ناولٹ ''وہ'' فاطمہ تاج ص نمبر ۵ بحوالہ نجم النساء، آزادی کے بعد حیدرآباد کی نثر نگار خواتین

تھا۔ اپنے والد کے زیر سایہ انہوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے والد ابوالحسن سید علی مرحوم نامور قانون داں اور سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما بھی تھے۔ مصنفہ کی شادی دوران تعلیم ہی جناب مصطفیٰ علی اکبر صاحب سے ہوئی جو آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ریڈر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ آمنہ ابوالحسن ۹/اپریل ۲۰۰۵ کو سرائے فانی سے عالم لافانی کو منتقل ہو گئیں۔

آمنہ ابوالحسن کو بچپن ہی سے کہانی لکھنے کا شوق تھا۔ ان کی پہلی کہانی ''ننھی کلی'' کے عنوان سے بچوں کے لیے شائع ہونے والے رسالے میں چھپی تھی، اس وقت موصوفہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں۔ کہانی شائع ہونے کے بعد ان کے قلم میں خود اعتمادی آ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تخلیقات یکے بعد دیگرے منظر عام پر آ گئیں۔ انہوں نے متعدد ناول لکھے ہیں جنھیں اردو ادب میں بہترین ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ''سیاہ سرخ سفید''، ''تم کون ہو''، ''واپسی''، ''مہک''، ''یادش بخیر'' وغیرہ۔

آمنہ ابوالحسن کا سب سے پہلا ناول ''سیاہ سرخ سفید'' ۱۹۶۸ء میں نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان حیدر آباد سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ ناول ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ایک رومانی ناول ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''تم کون ہو'' ۱۹۷۴ء میں نیشنل پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدر آباد سے شائع ہوا یہ ناول ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ایک معاشرتی ناول ہے۔ ان کا ایک اور ناول ''واپسی'' ۱۹۸۱ء میں موڈرن پبلشنگ ہاوس، گول مارکٹ سے شائع ہوا۔ ''یادش بخیر'' ۱۹۹۴ء میں موڈرن پبلشنگ ہاوس، دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوا۔ ''یادش بخیر'' کے پیش لفظ میں انھوں نے ایک شعر پیش کیا ہے جو یہ ہے۔

وہ روشنی جسے تہذیب نفس کہتے ہیں
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ بڑا اندھیرا ہے ؎۱

''یادش بخیر'' کا انتساب مصنفہ نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''اپنی دونوں بیٹیاں نیلوفر اور صنوبر کے نام جو نغمے، چشمے، قہقہے اور گیت ہیں میرے ______ خوشبوئیں ہیں زندگی کی ______ اور ارتقاء کے اس سفر کی راہی جو نئی نسل کے پیش قدم ہے اور ان تمام کرداروں کے نام بھی جو جان ہیں اس ناول کی۔'' ؎۲

ناول ''یادش بخیر'' میں قدیم تہذیب اور جدید دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں۔ مصنفہ نے ناول میں کہیں کہیں خود کلامی سے کام لیا ہے اور اس کے وسیلے سے کرداروں کے افکار و تصورات کی ترجمانی کی ہے۔

مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو آمنہ ابوالحسن کے ناول اردو ادب کے لیے ایک اہم اضافہ ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں ہر طرح کے موضوعات کو جگہ دی ہے۔ انہوں نے سماج میں رہ کر اس کا گہرائی سے مطالعہ کر کے اس کی اصل حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر انہوں نے عورتوں کے مسائل کے تعلق سے اپنے ناولوں کے ذریعہ ایک تحریک شروع کی۔ آمنہ ابوالحسن کے ناولوں میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انہیں ناول کے اسلوب، تکنیک اور فن پر خاصی دسترس حاصل ہے۔

۱/۲ ناول ''یادش بخیر'' از آمنہ ابوالحسن، ص اول

باب دوم
قمر جمالی سوانح اور شخصیت

خاندانی پس منظر:

قمر جمالی کا سلسلۂ نسب ایک بڑے جید بزرگ حضرت سید جلال شاہ بخاریؒ کے خاندان سے ملتا ہے۔قمر جمالی کی والدہ اس خاندان کی ساتویں پشت سے تعلق رکھتی ہیں اور قمر اسی خاندان کی نواسی ہیں۔دراصل یہ خاندان تبلیغ اسلام کی غرض سے بخارا(روس) سے ہندوستان آیا اور نلگنڈا کے موضع ایٹور میں سکونت پزیر ہوا اور وہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ان کی مزار کی زیارت کے لیے میلوں دور دیہات اور شہر سے لوگ جوق در جوق اپنی عقیدت کے والہانہ اظہار کے لیے آتے ہیں۔اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے قمر جمالی کہتی ہیں:

> ''آج بھی موضع ایٹور،ضلع نلگنڈہ میں میرے چھوٹے ماموں سید اسمٰعیل صاحب مرحوم کے مکان (میری نانی کا آبائی مکان) سے ہر سال عرس کا اہتمام بڑے جوش وخروش سے ہوتا ہے۔میرے ماموں کے مکان کے کونے کونے سے آج بھی درگاہ شریف کی خوشبو مہکتی ہے۔بچپن میں ہر سال وقت مقررہ پر ایٹور جایا کرتے تھے۔اب بھی میں اپنے شوہر کے ساتھ اس عرس میں شرکت کے لیے ایٹور جاتی ہوں۔'' [1]

قمر جمالی کے دادا کا نام محمد یعقوب شریف تھا لیکن گورے ہونے کے سبب ان کو گھر میں لالن کے نام

---

[1] ۔شخصی انٹریو،انٹریور جاوید احمد شاہ،۳ جنوری ۲۰۱۶ء ،اتوار دوپہر ۲:۳۰ بجے۔

سے پکارتے تھے۔قمر جمالی کے نانا کا اسم گرامی سید وزیر علی اور نانی کا محمودہ بی بی تھا۔دونوں کو اپنے مذہب سے اچھا خاصا لگاؤ تھا۔سید خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کو سماج میں کافی عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ساتھ ہی ساتھ قمر جمالی کے نانا زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے ان کے پاس کافی زراعتی زمین تھی۔قمر جمالی اپنے نانا کے بارے میں پوچھے جانے پر یوں گویا ہوئیں:

''میرے نانا کا نام سید وزیر علی تھا۔سید خاندان سے تعلق رکھنے کے سبب
ان کو سماج میں کافی عزت حاصل تھی۔اس کے علاوہ میرے نانا کا گھر
ایک زراعتی گھر تھا۔نانا مالی پٹیل تھے۔وہ لوگ سال بھر کے لیے اناج
جمع کرتے تھے اور ہر ضرورت مند کی بھی مدد کرتے تھے۔'' [1]

قمر جمالی کے والد محترم کا نام محمد جمال شریف اور والدہ محترمہ کا اسم گرامی افضل بی بی تھا۔دونوں ہی موضع ایٹور ڈسٹرکٹ نلگنڈہ کے رہنے والے تھے جو تقسیم آندھرا پردیش کے بعد اب تلنگانہ کا حصہ ہو گیا ہے۔قمر جمالی کے والد صاحب سنّی اور ان کی والدہ دونوں اطراف پدری اور مادری سید سلسلۂ نسب سے تعلق رکھتی تھیں۔قمر جمالی کے والد بہت ہی روشن خیال انسان تھے اور والدہ اس زمانے کی منشی کامل پڑھی ہوئی تھیں۔فارسی سے کافی واقفیت رکھتی تھیں۔فارسی کے محاوروں، روزمرہ، ضرب الامثال کا بہترین استعمال ان کی سرشت میں داخل تھا۔قمر جمالی کی والدہ

---

[1] ۔شخصی انٹرویو، انٹرویور جاوید احمد شاہ، ۱۱/اپریل ۲۰۱۶ء ، پیر شام ۵:۴۶ بجے۔

بہت ہی منظّم قسم کی خاتون تھیں۔قمر جمالی کے والد کا جب انتقال ہوگیا تو ان کی والدہ نے اپنی فیملی کی پرورش بڑے اچھے انداز میں کی۔قمر جمالی کے مطابق:

''والد صاحب کا جب انتقال ہوگیا تو ہمارے یہاں جینے کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ایسے حالات میں انہوں نے ہماری پرورش کی، میری والدہ بہت اچھی سلائی کرتی تھیں،جس سے ہمارا گھر چلتا تھا۔ جب امی کو بہت تکلیف ہوئی تب میں نے نوکری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔'' [1]

قمر جمالی کے والدین کی تین اولادیں ہوئیں اور تینوں میں کوئی بھی نرینہ نہ تھا۔قمر جمالی اپنے والدین کی پہلی صاحب زادی ہیں۔قمر جمالی کی دوسری بہن کا نام طاہرہ سلطانہ ہے،ان کی شادی حیدرآباد میں مرزا احمد بیگ سے ہوئی ہے۔طاہرہ سلطانہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ پچھلے پندرہ برسوں سے دوہا(قطر) میں مقیم ہیں۔موصوفہ کی سب سے چھوٹی بہن کا نام ساجدہ سلطانہ تھا۔جن کی شادی ۱۹۸۸ء میں حیدرآباد میں محمد عثمان سے ہوئی تھی۔ساجدہ سلطانہ دل کے عارضہ کی وجہ سے ۲۰۰۶ء میں انتقال کر گئیں۔انہوں نے ایم۔اے۔اردو کی ڈگری گولڈ میڈل کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ایم۔اے۔اردو کے ساتھ ساتھ انہیں عثمانیہ یونیورسٹی ہی سے بی۔ایڈ کی سند بھی حاصل ہوئی تھی اور بحیثیت اسکول ٹیچر انھوں نے زندگی کے ایام بسر کیے۔چھوٹی بہن کا صدمہ آج بھی قمر جمالی کے دل کے کتبے پر کندہ ہے۔قمر جمالی بہن کی موت کے بارے میں پوچھے جانے

---

[1] ۔شخصی انٹرویو،انٹرویور جاوید احمد شاہ، ۱۱/اپریل ۲۰۱۶ء ، پیر شام ۵:۴۶ بجے۔

پر یوں گویا ہوئیں:

''میری تیسری اور چھوٹی بہن بہت ذہین تھی۔اس نے اردو ادب میں ماسٹرز کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ایم۔فل۔کیا۔بی۔ایڈ کیا،جس کے بل بوتے پر اسے سرکاری فوقانیہ مدرسے میں ملازمت مل گئی مگر عمر نے وفا نہ کیا۔عین جوانی میں دل کے عارضہ سے ۲۰۰۶ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئی۔اس کی موت میرے دل کی رہی سہی تری بھی اڑا لے گئی۔میں نے اپنے والد اور والدہ کی موت کا صدمہ برداشت کر لیا تھا مگر اس کی موت آج بھی میری آنکھوں کے آگے تازہ ہے۔بالکل ابھی ٹھہرے لمحے کی طرح۔نہ وقت گزرتا ہے اور نہ وہ منظر نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔میرا دل قبرستان بن گیا ہے۔'' [۱]

پیدائش:

قمر جمالی کا اصلی نام قمر سلطانہ اور قلمی نام قمر جمالی ہے۔ادبی پہچان کے لئے والد محترم کے نام کے لاحقے کو اپنے نام کے ساتھ جوڑ لیا ہے۔قمر کے ساتھ اپنے والد کے نام کا جمال جوڑ کر قمر سلطانہ قمر جمالی ہوگئی۔کیوں کہ قمر جمالی کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں اس نام کا بڑا دخل ہے۔قمر جمالی کی پیدائش حقیقی اعتبار سے ۱۹۵۰ء کی ہے مگر اسکول ریکارڈ کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۲/ اپریل ۱۹۴۸ء ہے۔اپنی تاریخِ ولادت کے بارے میں پوچھے جانے پر قمر جمالی نے بتایا:

۱۔ شخصی انٹرویو،انٹرویور جاوید احمد شاہ،۱۱/اپریل ۲۰۱۶ء ، پیر شام ۵:۴۶ بجے۔

''سرکاری ریکارڈ کے مطابق میری زندگی کے سفر کی شروعات ۲/اپریل ۱۹۴۸ء سے ہوتی ہے لیکن یہ تاریخ حقیقی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔حقیقت میں میرا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔میرے والد محترم آبائی طور سے ایٹور میں رہتے تھے۔میں اپنی بہنوں اور والدہ سمیت حیدرآباد میں مقیم تھی۔اسکول میں داخلے کے بعد میری والدہ نے یہ فریضہ ایک ٹیچر کو سونپا،انہوں نے غیر شعوری طور پر ۱۹۵۰ء کے بجائے ۱۹۴۸ء تحریر کیا جو کہ درست نہیں ہے۔اصل میں میری تاریخِ ولادت ۲/اپریل ۱۹۵۰ء ہے۔'' [۱]

اس طرح قمر جمالی کی صحیح تاریخ پیدائش ۲/اپریل ۱۹۵۰ء ہے۔

تعلیمی سفر:

قمر جمالی کی ابتدائی تعلیم کا سفر حیدرآباد سے شروع ہوا۔پرائمری درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مارچ ۱۹۶۴ء میں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کاچی گوڑہ سے میٹرک کا امتحان اچھے نمبرات سے پاس کیا۔میٹرک کے بعد والد محترم کا شفیق سایہ سر سے اٹھ گیا مگر انہوں نے اپنا تعلیمی سفر بلا کسی تردد کے جاری رکھتے ہوئے پہلے بی۔اے۔(English, Sociology, Economics) عثمانیہ یونیورسٹی سے کیا۔اس کے بعد ایم۔اے۔انگلش لٹریچر میں اسی یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہی تھا کہ محکمہ مال (Department of Revenue) میں ۵ / مئی ۱۹۷۵ء کو سرکاری ملازمت مل گئی۔

۱۔ شخصی انٹرویو،انٹرویور جاوید احمد شاہ،۳۰جنوری ۲۰۱۶ء ،اتوار،دوپہر ۲:۳۰ بجے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے ایم۔اے۔ فارسی (عثمانیہ یونیورسٹی) میں داخلہ لیا اور اول درجے سے ایم۔اے۔ کامیاب کیا۔قمر جمالی اپنے تعلیمی سفر کے بارے میں پوچھے جانے پر کہتی ہیں:

''میرے تعلیمی سفر کا آغاز حیدر آباد سے شروع ہوا۔میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میرے والد صاحب اس دار فانی سے رخصت کر گئے مگر میری والدہ نے ہماری تعلیم پر خاصی توجہ دے کر ہمارے علمی سفر میں کوئی بھی پڑاؤ آنے نہیں دیا اور ہم تینوں بہنوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہمہ تن کوشاں رہیں۔میری شخصیت کی تشکیل میں میرے والدین دونوں والد اور والدہ محترمہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے اور آج میں جو کچھ بھی ہوں ان کی بدولت ہوں۔'' [1]

ملازمت:

والد کے انتقال کے بعد قمر جمالی شب و روز متفکر رہتی تھیں کہ کس طرح گھر والوں کی کفالت کی جائے۔انھوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا،جس کی بدولت انہوں نے گھریلو ذمہ داریوں کو بڑی بخوبی سے انجام دیا اور اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی۔جوں جوں ذمہ داریاں بڑھتی گئیں انہوں نے نوکری کرنے کا فیصلہ کیا اور ٹیچرس ٹریننگ کورس کر کے ایک پرائیوٹ

---

[1] ۔شخصی انٹرویو،انٹرویور جاوید احمد شاہ،۳ جنوری ۲۰۱۶ء ،اتوار دوپہر ۲:۳۰ بجے۔

اسکول میں بحیثیت مدرّسہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔اس کے بعد محکمہ مال گزاری (department of revenue) میں ۵/ مئی ۱۹۷۵ء کو بحیثیت جونیر اسسٹینٹ کے منصب پر فائز ہوئیں۔محکمہ مال گزاری میں انہوں نے ۲۸ سال تک خدمات انجام دیں۔ان ۲۸ برسوں میں وہ مختلف عہدوں پر فائز رہیں اور ترقی کرتے ہوئے تحصیل دار کے عہدے تک پہنچیں اور اسی اعلیٰ منصب سے اپریل ۲۰۰۶ء میں وظیفہ حسن خدمت سبکدوش ہوئیں۔ریٹائرمنٹ کے بعد ایم۔اے۔ فارسی جامعہ عثمانیہ سے ۲۰۰۸ء میں مکمل کیا۔اپنی ملازمت حاصل کرنے کے بارے میں قمر جمالی یوں رقمطراز ہیں:

''ابتدا ہی سے ہم استانی بننے کے خواہش مند تھے۔ٹریننگ بھی لے لی مگر_____رزق کا دینے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔

ع: دیتا ہے دینے والا جانے کہاں کہاں سے

کے مصداق اوپر والے نے ہمارے رزق کا زریعہ محکمہ مالگزاری سے جوڑ رکھا تھا، جہاں ہم نے ۳۵ سال ملازمت کی اور بحیثیت تحصیل دار ریٹائیر ہوئے۔ان ۳۵ سالوں میں ہم نے اپنی ذمہ داریوں کو مقدور بھر نبھایا بلکہ ضرورت سے زیادہ حق ادا کیا،جس کا حکومت آندھرا پردیش نے اعتراف بھی کیا اور ۲۰۰۲ء میں ہمیں ریاست کی طرف سے بیسٹ (MRO) ایوارڈ سے نوازا گیا۔'' ؎۱

؎۱ ناول ''آتش دان'' از قمر جمالی ص ۶

ریٹائرمنٹ کے بعد ۲۰۰۸ء میں NOESIS JUNIOR COLLEGE ٹولی چوکی حیدرآباد سے پرنسپل شپ کا آفر ملا جوانہوں نے قبول کرلیا کیوں کہ ابتدا سے ہی انہیں درس وتدریس کے شوق نے گرویدہ بنا رکھا تھا۔اس بات کا اعتراف انہوں نے خود اپنے ناول 'آتش دان' میں کیا ہے:

''ریٹائرمنٹ کے بعد ڈرامائی انداز میں ہمیں ایک جونیر کالج میں پرنسپل شپ ملی۔ڈرامائی اس طرح کہ ہم اپنے بھانجے کے ایڈمیشن کے سلسلے میں کالج گئے تھے۔پتا نہیں انہیں ہماری کون سی ادا پسند آئی۔یا پھر حکم خدا تھا کہ فون پہ ہمیں پرنسپل شپ کی آفر ملی جو ہم نے بلا تردید قبول کرلی کیوں کہ ابتدا ہی سے ہم استانی بننے کے خواہش مند تھے۔'' [1]

اس طرح ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۰ء تک وہ پرنسپل شپ کے فرائض اس کالج میں انجام دیتی رہیں۔

ازدواجی زندگی اوراولاد:

قمر جمالی ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۸ء کو حیدرآباد میں محمد محمود حامد سے رشتہ ازدواج میں بندھ گئیں۔محمد محمود حامد بذات خود ایک اچھے فکشن رائٹر ہیں۔''سر اٹھایا تھا''(نومبر ۱۹۹۸ء)،''محراب''(مارچ ۲۰۰۶ء)اور''طاس''(دسمبر ۲۰۰۷ء) ان کے افسانوی مجموعے ہیں جو چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔موصوف صدر مجالسی اکاؤنٹینٹ جنرلز آفس،حیدرآباد کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔دونوں کی ازدواجی زندگی بڑی خوش گوار رہی ہے۔دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ

---

[1] ناول ''آتش دان'' از قمر جمالی ص ۵

دوست کی طرح رہتے ہیں۔محمد محمود حامد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اخلاق بھی ہیں لیکن دونوں کے تخلیقی خیالات ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا ہیں۔محمود حامد صاحب اپنی اہلیہ قمر جمالی کے بارے میں ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میری رفیق حیات صبر و قناعت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ہم نے ساری زندگی زیادہ تر دوست ہی کی طرح گزاری ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو ادب سے دلچسپی رہی ہے۔اگرچہ ہماری فکر، زبان و بیان، خیالات ایک دم مختلف ہیں مگر اس سے آج تک ہماری ازدواجی زندگی پر کوئی بھی ایسا اثر نہیں پڑا جسے ہماری محبت اور انسیت میں فاصلے بڑھ گئے ہوں۔ہم دونوں اپنے فن پاروں کے اولین قاری ناقد ہوتے ہیں اور آپسی مشوروں کو تسلیم کرتے ہیں۔علاوہ ازیں ان کے فنی خصائص اور نقائص پر بحث و مباحث ہوتے رہتے ہیں۔ان مباحث میں اکثر و بیشتر اچھے نقطے سامنے آتے ہیں جو ان فن پاروں میں حسن کا تنوع پیدا کرتے ہیں۔''[1]

قمر جمالی کے ہاں تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔پہلی لڑکی، جس کا نام صبا قونین ہے جو ایک امریکن بینک میں ملازم ہے۔اس کی شادی ۲۰۰۵ء میں حیدرآباد میں ہوئی اور ان کے شوہر محمد احد خان حیدرآباد کے ایک جانے پہچانے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ بھی ایک امریکن بینک میں اپنی

---

[1] ۔شخصی انٹرویو، انٹرویور جاوید احمد شاہ، ۳ جنوری ۲۰۱۶ء، اتوار دوپہر ۲:۳۰ بجے۔

سروس کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دوسری بیٹی نیشا نورین ایک multi national company میں اسسٹینٹ مینیجر کے عہدے پر فائز ہیں۔ نیشا نورین کی شادی ۲۰۰۶ء میں محمد اشفاق علی سے حیدرآباد میں ہوئی اور وہ بھی اسی فرم میں ملازم ہیں۔ تیسری بیٹی شما درین نے ہندوستان سے B.tech کی تعلیم حاصل کی، اُس کے بعد انگلینڈ سے انھوں نے ایم۔ ایس۔ کیا اور اس کے روزگار کا وسیلہ بھی ایک multi national کمپنی سے منسلک ہے۔

ادبی سفر:

قمر جمالی کو بچپن ہی سے کہانی لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ طالب علمی کے دوران جب ان کی ٹیچر انہیں کسی موضوع پر مضمون لکھنے کو کہتی تھیں تو وہ اس میں ایک کردار کو شامل کر کے کہانی کا جامہ پہنا دیتی تھیں۔ یہیں سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔

قمر جمالی کے ادبی سفر کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

> ''قمر نے کہانی لکھنی کیوں شروع کی؟ یہ بھی ایک عجیب حقیقت ہے۔ اسکول میں جب اسے کوئی مضمون لکھنے کو کہا جاتا تو اس کا مضمون دوسروں سے الگ ہوتا۔ وہ انشائیہ نہ ہوتا بلکہ وہ ایک کردار کے اطراف گھومتا۔'' [1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ قمر جمالی کے اندر کا ادیب طالب علمی کے زمانے ہی سے

---

[1] قمر جمالی، افسانوں کا مجموعہ ''شبیہ'' ، ص ۱۷۔

متحرک تھا، جس کے باعث وہ مضامین میں بھی کردار سازی کرتی تھیں۔

حیدرآباد کی ادبی محفل میں جب قمر نے اپنی پہلی کہانی سنائی تو تقریباً سبھی لوگوں نے قمر کی اس کہانی کو کسی دوسرے کی کہانی سمجھ کر قمر کے دل کو بہت ٹھیس پہنچائی مگر اس ادبی محفل میں علامہ حیرت بدایونی بھی شریک تھے، جنہوں نے قمر جمالی کی بہت حوصلہ افضائی کی وہیں سے قمر جمالی کا قلم چل پڑا۔ اس کے بعد انھیں کافی حوصلہ ملا۔ پھر کیا تھا، انھوں نے بہت تیزی کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت ساری کہانیاں ملک کے معتبر رسالوں میں بھی چھپنے لگیں۔

قمر جمالی کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ''اے چاند چھپ نہ جانا'' سے ہوا جو ایک عشقیہ موضوع پر مبنی کہانی ہے جو ایک ہفتہ وار اخبار ''رسالہ روداد حیات'' دہلی میں ۱۹۶۶ء میں چھپا تھا۔ اس وقت قمر جمالی کی عمر ۱۴ سال تھی۔ اس کے بعد ان کی دوسری کہانی ''فاصلے مٹ گئے'' ۱۹۶۹ء میں رسالہ ''بیسوی صدی'' میں دہلی سے شائع ہوئی۔ پھر ان کے قلم میں توانائی آ گی اور وہ افسانہ نگاری کی طرف باقاعدگی سے توجہ دینے لگیں۔ ہندوستان کے تمام معتبر اور معروف رسائل کے علاوہ پاکستان کے رسالہ بادبان، سخنور، منشور میں قمر جمالی کی کہانیاں شائع ہوئیں ہیں۔

قمر جمالی نے تمام نثری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مثلاً انشائیے، ریڈیو فیچر، اخباروں کے کالم، رپوتاژ، سفرنامے، ناول لکھے ہیں۔ افسانوں پر گہری سوچ رکھنے والی اور افسانوں میں اپنی منفرد پہچان بنانے والی قمر جمالی کے اب تک پانچ مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 'شبیہ ۱۹۹۰ء'، 'سبو چہ نومبر ۱۹۹۲ء'، 'سحاب اپریل ۲۰۰۱ء'، 'زہاب دسمبر ۲۰۰۷ء'، 'صحرا بکف اپریل ۲۰۱۵ء'۔ ان افسانوی مجموعوں کو آندھرا پردیش اردو اکادمی نے ایواڈز سے نوازا ہے۔

افسانہ نگاری کے علاوہ انہوں نے ڈراما نگاری کی طرف بھی توجہ کی ۔انہوں نے پہلے پہل ڈرامے ریڈیو کے لیے لکھے پھر بعد میں ان کو کتابی شکل دیتے ہوئے ''سنگ ریزے'' کے عنوان سے ۱۹۹۳ء میں خورشید پریس ،چھتہ بازار،حیدرآباد سے شائع کیا۔ علاوہ ازیں انشائیہ نگاری کی طرف بھی موصوفہ کی طبیعت مائل تھی ۔ان کا پہلا انشائیہ ''اے راحت دل کیا کروں'' ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو روز نامہ سیاست میں شائع ہوا، دوسرا انشائیہ ''لمحوں کے جھروکے'' روز نامہ عوام میں شائع ہوا اور تیسرا ''محشر بپا کرے گی یہ پیاز کی ڈلی'' سیاست میں یکم جنوری ۲۰۱۱ء کو شائع ہوا۔ بحیثیت خاکہ نگار انہوں نے تقریباً سولہ خاکے لکھے ہیں، جن میں، یادِعظمت، محترم آر بانو صاحبہ، غالب کا عاشق شاہ علی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ وغیرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں ۔قمر جمالی نے افسانہ نگاری، ڈراما نگاری، ناول نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری اور مقدمہ وتبصرہ نگاری کے علاوہ مضمون نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے ۔انہوں نے متعدد مضامین بھی لکھے ہیں جو ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔

مذکورہ ادبی پاروں کے علاوہ انھوں نے سفر نامے بھی لکھے ہیں۔سفر نامہ شاخِ نبات افسانوی مجموعہ 'سبو چہ' میں شامل ہے، ان کا پہلا سفر نامہ ہے جو Goa کے سفر کا احاطہ کرتا ہے۔ دوسرا سفر نامہ افسانوں کے مجموعہ 'زہاب' میں 'آخری تنکوں' کے نام سے ہے جو کنیا کماری کے سفر سے تعلق رکھتا ہے۔ان کا ناول ''آتش دان'' ۲۰۱۴ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ 'آتش دان' کی زبان بہت ہی آسان ہے ۔اس میں وقت کے فلسفے کو لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اشاروں کنایوں میں زندگی کے فلسفے کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے ۔وقت کے ساتھ ساتھ ہمیں اس ناول میں بہت

سے ایسے مسائل ملتے ہیں جو ہماری روزمرہ کی زندگی اور سیاسی مسائل سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سے انھوں نے ہمیں اپنی زندگی سے جڑے مسائل پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

ان کے ادبی سفر کا کارواں یہیں نہیں ٹھہرتا بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے وہ صحافت جیسے سنگلاخ میدان میں بھی اپنے قلم کا لوہا منوانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اپنے کالموں اور مختلف طے شدہ عنوانات پر قلم اٹھاتی ہیں اور یہاں بھی کامیاب رہی ہیں۔انہوں نے روز نامہ ''عوام'' حیدرآباد میں ۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۰ء تک ادبی صفحہ'' دھنک'' کی نگران کار کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ تقریباً چار سال تک مسلسل ادبی کالم لکھتی رہی ہیں۔سہ ماہی' تناظر' کی ادارت کی ذمہ داری بلراج ورما نے قمر جمالی کے سپرد کی تھی اور اس ذمہ داری کو انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ یہ سہ ماہی رسالہ پہلے دہلی سے شائع ہوتا تھا پھر بلراج ورما کے کہنے پر قمر جمالی نے اس کا ایک ایڈیشن حیدرآباد سے نکالا، جس کو ۱۹۹۶ء میں کتھا جرنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پھر موصوفہ نے اپنی نجی مصروفیات کے سبب اس ذمہ داری کو واپس بلراج ورما کو منتقل کردیا۔

قمر جمالی کی تصانیف کے دوسری زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔فاتح عالم (افسانہ) انگریزی زبان میں چھپا ہے، جسے پروفیسر راجندر سنگھ ورما نے چنڈی گڑھ یونیورسٹی سے بعنوان (Conqueror of the world) شائع کیا۔

۲۔ان کا افسانہ ''اگنی پرویش'' ہندی زبان میں بھی اسی نام سے چھپا ہے، جسے ڈاکٹر اہلیہ مشرا نے ترجمہ کیا اور یہ (Sankalpon Ke Saaye) میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔

۳۔افسانہ ''اپج'' کا اوڑیا(Oriya) زبان میں ترجمہ ڈاکٹر نسیمہ بیگم نے (Ankour) کے نام سے کیا ہے جو Sparrow Publications Mumbai سے شائع ہوا۔

۴۔ افسانہ ''کفن'' کو شری ایم۔اسدالدین نے انگریزی میں (Shorud) کے نام سے Urdu Fictions by katha 2008, New Delhi سے شائع کیا ہے۔

۵۔افسانہ ''کھنڈر'' کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر عافیہ بانو، نے کیا اور یہ South California Asian Review سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔

۷۔دہلی کی جانب سے ساہتیہ اکادمی نے ۲۷مارچ ۱۹۹۳ء تا ۲ اپریل ۱۹۹۳ء میں منعقدہ ترانسلیشن ورکشاپ میں اپنے افسانے ''اس گھر کی دوپہر'' کو The house the Astronmer کے عنوان سے قمر جمالی نے ترجمہ کیا ہے۔

ادبی اداروں اورانجمنوں سے وابستگی:

قمر جمالی کا ادبی حلقہ بہت وسیع ہے اورانھوں نے اپنا اثر ورسوخ اس طرح سے بڑھایا ہے کہ ہر انجمن اور محفل میں ان کے نہ صرف چہیتے بلکہ ان کے اپنے معتقد بھی وسیع تر پیانے پر موجود پائے جاتے ہیں۔وہ کئی ادبی اداروں اورانجمنوں سے وابستہ ہیں،جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ا۔قمر جمالی انجمن ترقی پسند مصنفین ،حیدرآباد کی باضابطہ رکن ہیں۔وہ اس انجمن کی سیکریٹری بھی رہ چکی ہیں اور ترقی کے منازل طے کر کے آج وہ انجمن کی جنرل سیکریٹری کے عہدے پر اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

۲۔۲۰۰۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین ،اعظم گڑھ کی جانب سے ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں

انہوں نے قمر جمالی کو بطور سیکریٹری مدعو کیا تھا۔

۳۔''حلف'' حیدرآباد لٹریری فورم کی ۲۰۰۷ء تا ۲۰۰۹ء تک وہ جوائنٹ سیکریٹری رہ چکی ہیں اور ۲۰۱۰ء سے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں اور کئی مرتبہ وہ صدر مہمانِ خصوصی کے طور پر بھی اس انجمن میں سرگرم رہی ہیں۔

۴۔انجمن محفل خواتین حیدرآباد کی ۱۹۷۵ء سے رکن ہیں۔اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً دہلی، کٹک، اڑیسہ، چندی گڑھ، الہٰ آباد، بروڈا، بینگلور وغیرہ میں بھی وہ کئی اداروں اور انجمنوں سے وابستہ رہ چکی ہیں۔

انعامات واعزازات:

قمر جمالی نے آج تک ادبی دنیا کے لئے بہت سے کارنامے انجام دیے ہیں۔ان کے کارناموں میں جہد اور جگر کاوی کے ان مٹ نقوش آج بھی ادبی دنیا کے کتبے پر آبِ زر سے کندہ ہیں۔ان کی اس کوشش اور سخت محنت کے صلہ میں انہوں نے بہت سے انعامات واعزازات حاصل کیے ہیں، جس سے ان کی ادبی شخصیت کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔علاوہ ازیں قمر جمالی کی شخصیت میں سب سے بڑی بات جو ان کی شخصیت کی طرف راغب کرتی ہے، یہ ہے کہ جہاں انہوں نے فکشن میں ناموری حاصل کی وہاں انہوں نے تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود بھی اپنے عہدے کے تئیں انصاف کیا اور وہاں بھی مختلف انعامات واعزازات سے نوازی گئیں۔اکادمی اور انجمنوں سے حاصل شدہ مختلف ایوارڈز مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''شبیہ'' ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا جس کو آندھرا پردیش اردو اکادمی کی جانب

سے دوسرا انعام ملا۔

۲۔''سبو چہ'' ۱۹۹۲ء جو کہ ان کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے، پر آندھرا پردیش اردو اکادمی کی جانب سے پہلا انعام حاصل ہوا۔

۳۔''سنگریزے''ان کے ڈراموں کا مجموعہ ہے ،جس کی اشاعت۱۹۹۳ء میں ہوئی تھی اس پر بھی آندھراپردیش اردو اکادمی کی طرف سے اول انعام حاصل ہوا۔

۴۔آندھرا پردیش اردو اکادمی کی جانب سے ان کے افسانوی مجموعے''سحاب''۲۰۰۱ء پر بھی پہلا انعام ملا۔

۵۔آندھراپردیش اردو اکادمی کی جانب سے ان کے افسانوی مجموعے'زہاب'۲۰۰۷ء پر بھی پہلا انعام ملا۔

۶۔''انعکاس''۲۰۱۴ء جو کہ ان کے تبصروں اور مضامین کا مجموعہ ہے اسے بھی آندھراپریش اردو اکادمی نے اول ایوارڈ سے نوازا ہے۔

۷۔''آتش دان''۲۰۱۵ء، جو کہ ان کا پہلا ناول ہے کو بھی آندھراپردیش اردو اکادمی نے پہلے انعام سے نوازا۔

۸۔میرا اکادمی لکھنو، کی طرف سے'امتیاز میر ایوارڈ' سے انھیں ۱۹۹۷ء میں نوازا گیا۔

۹۔ساہتیہ اکادمی، دہلی، کی جانب سے ۱۹۹۵ء میں قمر جمالی کو travel grant orissa state کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۱۰۔بحیثیت ایڈیٹر انہوں نے کئی سارے اعزازات حاصل کیے ہیں۔جیسے کتھا ایوارڈ دہلی، کتھا جرنل

ایوارڈ برائے 'تناظر' سہ ماہی دہلی ۱۹۹۹ء۔

۱۱۔آندھرا پردیش اردو اکادمی کی طرف سے مجموعی ادبی خدمات ایوارڈ ۲۰۰۷ء برائے فکشن، جس میں ۲۵۰۰۰ روپیہ نقد اور توصیف نامہ شامل ہے۔

۱۲۔حکومت آندھرا پردیش نے قمر جمالی کو ۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۸ء میں community service ایوارڈ بحیثیت سماجی کارکن سے نوازا۔

اعزازات بحیثیت آفیسر:

۱۔حکومت آندھرا پردیش نے قمر جمالی کو سرکاری خدمات کے سلسلے میں بیسٹ MRO ایوارڈ سے ۲۰۰۲ء میں نوازا۔

۲۔نیشنل ریڈ کراس سوسائٹی آف انڈیا کی جانب سے انہیں ۲۰۰۳ء میں gold medal سے نوازا گیا۔

سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت:

اپنے وجدان میں کئی ادبی جہتیں رکھتے ہوئے ہندوستان کے ادبی ماحول میں کئی بار قمر جمالی کو پزیرائی حاصل ہوئی ہے اور شہرتِ دوام کے دربار میں قمر جمالی کا ناول اور افسانے پیش پیش ہیں۔مجموعہ ''سبوچہ''،جس کی رسم رونمائی دلی کے کانٹی ٹیوشن کلب میں ہوئی تھی ۔ اس تقریب کی صدارت سابق وزیراعظم ہند جناب اندر کمار گجرال نے فرمائی تھی۔ان کی اس کتاب کو تناظر پبلی کیشن نے چھاپا تھا۔

انجمن ترقی اردو ہند نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر قمر جمالی کو راج بہادر گوڑ پر مقالہ پڑھنے کی غرض سے دہلی مدعو کیا اور اس وقت ان کے رفیق حیات ان کے رفیق سفر تھے۔اس مقالہ میں انھوں نے ڈاکٹر گوڑ کی کئی علمی جہتوں کو آشکار کیا ہے اس مقالے سے ان کے علمی تشخص کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ادبی رسالہ ''تناظر'' کی ادارت بلراج ورما نے قمر جمالی کو جب سونپی تو انہوں نے بلا تامل قبول کیا اور اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے کر اس رسالہ کو بام عروج تک پہنچایا۔رسالہ کے پہلے ہی شمارے کو ''کتھا'' (قومی سطح کا ایک ادبی ادارہ ہے جو ہندوستانی ادب کی ترویج میں منہمک رہتا ہے) نے best journal ایوارڈ سے نوازا۔اس ایوارڈ کو بحیثیت پبلیشر حاصل کرنے کے لیے ۱۹۹۷ء میں قمر جمالی دہلی تشریف لے گئیں۔

''اسمیتا'' (asmita) جو خالص خواتین کا ایک ادارہ ہے، اس کے سمیناروں میں بھی قمر جمالی کو کئی دفعہ شرکت کرنے کا موقع ملا ہے۔اس طرح قمر جمالی دہلی کے ادبی حلقوں سے آشنا ہوئیں۔سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد کے تحت جب سہ روزہ قومی سیمینار بعنوان ''اردو افسانہ'' منعقد ہوا تو اس میں شرکت کرتے ہوئے قمر جمالی نے اپنا ایک افسانہ پیش کیا تھا۔۱۹۹۷ء میں قمر جمالی کو امتیاز میر ایوارڈ ملا جس کو حاصل کرنے کی غرض سے وہ لکھنو گئیں اور وہاں منعقدہ سیمینار میں مقالے کے ساتھ ساتھ افسانہ بھی پیش کیا۔

ہندوستان کے کئی علاقوں کا سفر کرنے کے ساتھ ساتھ قمر جمالی نے بیرون ممالک کا سفر بھی کیا ہے۔بیرون ممالک کے سفر میں انہوں نے دوحہ (قطر) میں ادیبوں کی جانب سے دعوت نامہ قبول کیا اور بطور ادیب کے دعوت نامے پر اس بزم میں شرکت کی۔اس کے علاوہ ۲۹/اپریل ۲۰۱۱ء کو زندہ

دلان قطر میں ''اردو ڈیرہ'' کے عنوان سے منعقد پروگرام میں شرکت کی اور اپنا افسانہ بھی سنایا۔ یکم مئی ۲۰۱۱ء کو بزم اردو قطر کی جانب سے ایک خیر مقدمی جلسہ ہوا جس میں جمالی صاحبہ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس جلسہ میں قمر جمالی نے افسانے کی کئی فنی جہتوں پر روشنی ڈالی۔ ۲۱/ مئی ۲۰۱۱ء کو انجمن محبان اردو ہند کی جانب سے ایک خیر مقدمی جلسہ کا انعقاد عمل میں لایا گیا، جس کا موضوع ''حیدر آباد میں افسانہ نگاری'' تھا۔ اس جلسہ میں قمر جمالی نے بھی اپنی آرا کا اظہار خیال کیا تھا۔

قمر جمالی کے فن پارے درخشندگی اور تابندگی کے جوہر سے بھرپور ہیں۔ یہ ایک فطری تقاضہ ہے کہ انسان جس چیز سے لگاؤ زیادہ رکھتا ہے، اس چیز کی خوبیوں اور کمزوریوں کو باریک بینی سے پرکھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ قمر جمالی نے موقع بہ موقع سیمیناروں، انجمنوں اور دیگر ادبی محفلوں کے ذریعے ادبی خدمات انجام دیں اور ادبی دنیا میں اپنی ذات کو تابندہ و پائیندہ بنایا۔ اردو ادب کی تاریخ میں جب خواتین کی خدمات کا ذکر کیا جائے گا، اس وقت قمر جمالی کا نام بھی احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

شخصیت

شخصیت کا لفظ بہت وسیع اور گوناں گوں مفہوم کا حامل ہے۔شخصیت انسان کی سیرت اور کردار سے بنتی ہے۔کسی بھی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں اس کے ظاہری خد وخال ،سراپا ،انداز و اطوار ،چال ڈھال،مزاج ،عادات ،خیالات ،نظریات اور رویے وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔پھر اس شخصیت کو زندگی میں پیش آنے والے کچھ حالات ،واقعات بالخصوص بچپن اور جوانی سے متعلق ،گھر اور معاشرے کے ماحول ،سماجی ،معاشی رویے اور کچھ دیگر شخصیات کے اثرات بھی اس شخصیت کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔قمر جمالی کی شخصیت سازی میں بھی مذکورہ بالا عوامل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اس طرح ان کی شخصیت کا عکس اور اثرات ان کے فن میں پوری طرح در آئے ہیں۔

قمر جمالی کی شخصیت کی ساخت و پرداخت اور ان کی شخصیت کو تشکیل دینے میں جہاں بہت سے خارجی اور داخلی عناصر کارفرما تھے وہیں ان کی زندگی کے ذاتی حالات و تجربات اور پھر عصری اثرات نے بھی ان کی شخصیت کے ارتقا میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔قمر جمالی ایک اچھی افسانہ نگار ہیں۔ساتھ ہی اہم شخصیت ہونے کے باوجود ان کی شخصیت میں تکبّر ،تصنع اور بناوٹ کے بجائے سادگی ہے جو ان کے پہناوے، بات چیت اور انداز و اطوار سے صاف جھلکتی ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شخصیت کی ظاہری جھلک شخصیت کے بارے میں ایک اہم اور فیصلہ کن تاثر قائم کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔شخصیت اور فن کے حوالے سے قمر جمالی کی تحریریں ہم جیسے جیسے پڑھتے

جاتے ہیں ان کی شخصیت کے رنگا رنگ پہلو ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک شخص کو شخصیت بنانے میں یا ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں سب سے پہلے والدین کی تربیت کا اہم کردار ہوتا ہے۔قمر جمالی پر ان کے والد کی کشادہ ذہنی کا کافی اثر ہے، اپنی پرورش و پرداخت کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''میں جس ماحول میں پلی بڑی وہاں لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی حالانکہ میرے والد کا تعلق موضع ایٹور سے تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے مجھے اور میری بہنوں کی تعلیم اور اچھی پرورش کا ہمیشہ خیال رکھا۔اس ضمن میں انہوں نے ہمیں اپنی امی کے ہمراہ حیدر آباد منتقل کیا تا کہ ہماری تعلیم کا بہترین انتظام ہو۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمیں ذہنی وفکری آزادی دی جس کی بدولت ہماری شخصیت ایک اچھے ماحول میں پروان چڑھی۔'' [۱]

انسانی ذہن ،نفسیات ،مزاج ،عادات اور رویوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں جہاں داخلی و خارجی حالات و واقعات کا گہرا اثر ہوتا ہے، وہیں اس سے اپنی زندگی میں چند ایسی شخصیات سے ضرور واسطہ پڑتا ہے جو نہ صرف اس کے خیالات اور کردار پر گہرا اثر چھوڑتی ہے بلکہ ان شخصیات کے اثرات اس کی اپنی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔قمر جمالی کی شخصیت کی اس انفرای

---

[۱] شخصی انٹرویو،انٹرویور جاوید احمد شاہ،۳ جنوری ۲۰۱۶ء ،اتوار دوپہر ۲:۳۰ بجے۔

نہج کی نشو ونما میں بھی بہت سی شخصیات نے اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔سب سے پہلے ان کے اپنے والدین کی شخصیت کے گہرے اثرات ان کی اس نشو ونما کی محرک بن گئی۔اس کے بعد ایک محفل میں قمر جمالی کی ملاقات علامہ حیرت بدایونی سے ہوئی۔اس محفل میں قمر نے کہانی سنائی تھی،جس کو حیرت بدایونی نے بہت پسند کیا مگر وہاں پر بیٹھے تقریباً سبھی لوگوں کا ماننا تھا کہ یہ قمر کی خود کی تخلیق نہیں ہے۔اس بات کی وضاحت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنے مضمون بعنوان قمر کی کہانیاں میں کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''ایک دن محفل سجی جس میں علامہ حیرت بدایونی بھی شریک تھے۔قمر نے جو ابھی کم عمر ہی تھی اس محفل میں اپنی پہلی کہانی سنائی،لڑکوں نے آوازے کسے کس سے لکھوائی ہے؟تم تو ابھی بچی ہو وغیرہ کہانی ختم ہوئی اور قمر روتی ہوئی اسٹیج سے اتری۔علامہ حیرت بدایونی نے اس کی پیٹھ ٹھونکی کہا بیٹی یہ تو ہوتا ہی ہے۔ایسے تجربوں سے گزرنا ہوگا________۔'' [۱]

قمر جمالی کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا ایک اہم نام ہے۔مصنفہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی شخصیت سے بہت ہی زیادہ متاثر تھیں۔قمر جمالی کو ان میں انسانیت کا وہ نمونہ نظر آتا ہے جو قابل تقلید ہے۔وہ ان کی بے پناہ عزت کرتی تھیں۔ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ہر وقت قمر

---

[۱] افسانوں کا مجموعہ ''شبیہ'' از قمر جمالی،ص ۱۸۔

کی حوصلہ افزائی کی ،جس کی بدولت قمر کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوا اور انھوں نے اس ہمت وحوصلہ افزائی کا اعتراف کچھ اس طرح کیا ہے:

''میں احسان مند ہوں اس حسن اتفاق کی کہ جس کی بنا پر مسودہ ''شبیہ'' پر محترم جناب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب جیسے اردوداں کی رائے حاصل ہوئی۔ کیوں کہ ایک بار اخبار میں میری ایک کہانی کا ریویو پڑھ کر انھوں نے تذکرۃً مجھ سے کہا تھا بھئی قمر جمالی تمھاری وہ کون سی کہانی ہے جس کے بارے میں اخبار میں یوں لکھا ہے؟ بس دو تین دن بعد وہ سارے مسودے جو شبیہ میں شامل ہیں لے کر ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر پہنچ گئی۔ میں تو بہت سہمی ہوئی تھی کہ میری اس جرات پر ڈاکٹر صاحب ضرور کوئی منفی تاثر لیں گے،مگر انھوں نے میرا کچھ ایسا خیر مقدم کیا کہ بس ایک باپ ہی اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کرسکتا ہے۔'' [1]

قمر جمالی کو زمانہ طالب علمی سے ہی پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔قمر زیادہ تر انگریزی ادب کا مطالعہ کرتی تھیں۔جس کے باعث ان کے خیالات وافکار میں کافی وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہوا۔ انگریزی ادب کے مطالعے کے باعث ان کے اسلوب میں جدت طرازی کا حسن پیدا ہوا۔انجمن ترقی پسند مصنفین سے منسلک ہونے کے سبب قمر کی شخصیت اور فن پر اسکا اثر بھی رونما ہوا۔قمر جمالی ایک جامع شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ نہایت خوش مزاج ،نیک سیرت ،بلند خیال اور سنجیدہ خاتون

---

[1] افسانوں کا مجموعہ ''شبیہ'' از قمر جمالی،ص ۱۸۔

ہیں۔طبیعت میں توازن ،نرمی اور ہمدردی ہے ۔ان کے اخلاق و عادات متاثر کن ہیں ۔قمر معتدل مزاج اورشریف النفس خاتون ہیں۔ان کے مزاج میں تلخی نہیں اوران کومشرقی اقدار کی پاس داری کا بھر پور لحاظ ہے۔ ہر کسی سے خلوص ومحبت کے ساتھ پیش آتی ہیں۔اپنے اسلاف کا ادب و احترام چھوٹوں سے محبت ومشفقانہ برتاؤ اور دوست احباب کے ساتھ مخلصانہ و ہمدردانہ رویہ رکھتی ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ سبھی ان سے محبت کرتے ہیں اوران کا احترام بھی کرتے ہیں۔

قمر جمالی باشعور،حساس ،ذہین اور ذہنی پختگی کی حامل شخصیت کے طور پر بآسانی مشہور ہیں۔قمر کی شخصیت کا سب سے لائق تحسین اور غالب پہلو یہ ہے کہ ان کے ظاہر اور باطن میں کوئی تفریق نہیں پائی جاتی ۔قمر جمالی ملنساری و ہمدردی کی عظیم صفت کے علاوہ اخلاق اورانسانی اقدار کی پاسدار بھی ہیں۔ایک انسان،استاد،شاگرد،دوست اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ہمیشہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔بطور انسان وہ بڑی روا دار اور محبت کرنے والی شخصیت ہیں۔دوسروں کی باتوں پر کھل کر اور فراخ دلی سے داد دیتی ہیں۔ جمالی کا معاصرین کے ساتھ بھی دوستانہ رویہ رہتا ہے۔انہوں نے ذاتی بغض،حسد اور جلن سے خود کو ہمیشہ دور رکھا ہے۔وہ ہر کسی سے بڑی فراخ دلی سے ملتی ہیں۔کسی صلہ اور ستائش کی پروا نہیں کرتیں اور معاصرانہ چشمک سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔

حلیہ:

سانولا رنگ ،بڑی بڑی آنکھیں ،قد متوسط ،توانا اعصاب ،لہجے میں روانی ،باتوں میں جولانی ،آواز اونچی لیکن ایسی تلخ نہیں جو سماعت پر گراں گزرے بلکہ ایسی شیریں جو دلوں کو بھائے

غرض قمر جمالی کی شخصیت میں عجیب سی رعنائی ہے۔اگر ایک بار کوئی ان سے ملاقات کر لیتا ہے تو بار بار ان سے ملنے کا متمنی رہتا ہے۔ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے ان کا حلیہ بھی کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''سانولی سلونی خوب رو،خوش قد و قامت ،ملنسار، متبسم لڑکی کا نام قمر جمالی تھا۔'' [1]

غذا:

قمر جمالی کا ماننا ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی کوئی بھی نعمت خراب نہیں ہوتی۔قمر جمالی زیادہ تر سادہ غذا کھانا پسند کرتی ہیں۔اس کی کئی وجوہ ہیں۔ان کی بڑی نند گھر میں اکثر بیمار رہتی ہیں۔نیز وہ آرتھر اینیٹس کی مریض ہیں اور ان کے شوہر کو بھی Kideny problem ہے۔اس لیے سادہ غذا ہی قمر جمالی اور ان کی فیملی پسند کرتی ہے۔

قمر جمالی غذا کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''بہت ہی سادہ غذا کھاتی ہوں، پہلے سے بھی بہت سادہ۔ ہمارے شوہر کو Kideny problem ہے تو ہم لوگ گوشت بہت کم کھاتے ہیں۔ بریانی مجھے بہت پسند ہے۔ میں بڑے شوق سے کبھی کبھی بریانی بناتی ہوں اور کھاتی بھی ہوں، ترکاری دال بہت شوق سے کھاتے ہیں، جس دن میرے بچے آتے ہیں اس دن ہمارے گھر میں گوشت بنتا ہے۔ترکاریوں میں پالک کی بھاجی، میتھی کی بھاجی، بہت پسند ہے۔

---

[1] افسانوں کا مجموعہ ''شبیہ'' از قمر جمالی، ص ۲۷۔

کھٹے شوربے کا استعمال ہمارے یہاں زیادہ ہوتا ہے ۔چائے میں بڑے شوق سے پیتی ہوں ۔پھل بس کبھی کبھی کھاتی ہوں، جیسے ہر گھر میں کھانے کے بعد پھل کھانے کا رواج ہے ۔ ہمارے یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔''[1]

اس بات سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ قمر جمالی اور ان کے اہل خانہ بہت ہی معتدل انداز میں زندگی گزارتی ہے۔ان کے گھر میں سیدھے سادے معیار زندگی کو پسند کیا جاتا ہے۔

معمولاتِ زندگی:

قمر جمالی ایک سینیر فکشن رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ دار خاتون بھی ہیں ان کے معمولات زندگی میں لکھنا پڑھنا، پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا ،قرآن شریف کی تلاوت کرنا وغیرہ شامل ہیں ۔لکھنا پڑھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے،اس کے لیے انھوں نے کوئی مخصوص وقت مختص نہیں کیا ہے۔قمر جمالی کے مطابق:

''فجر کی نماز کے بعد میں قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہوں اور پھر نو بجے تک لکھنا پڑھنا۔اس کے بعد گھر کے کاموں میں مصروف ہوجانا، جیسے جھاڑو دینا ،صفائی کرنا، کھانا بنانا ، کپڑے دھونا وغیرہ ۔ان سب کاموں میں میری بڑی نند جو پچھلے ۳۸ سال سے ہمارے ساتھ رہتی ہیں وہ بھی مدد کرتی ہیں لیکن بذات خود زیادہ میں ہی کرتی ہوں ۔ میں اپنے

---

[1] ۔شخصی انٹریو،انٹریور جاوید احمد شاہ،۱۱/اپریل ۲۰۱۶ء ، پیر شام ۵:۴۶ بجے۔

گھر کی نوکرانی بھی ہوں اور رانی بھی۔ لکھنے پڑھنے کے لیے مجھے خاص وقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب بھی میرا مزاج لکھنے پڑھنے کے لیے بن جاتا ہے تو میں بلا کسی تامل کے قلم کاپی اٹھاتی ہوں اور لکھنا شروع کر دیتی ہوں۔'' ۱

قمر جمالی کا کہنا ہے کہ میرا ایک ہی واحد شوق ہے اور وہ ہے ادبی محفلوں میں جانا، ادبی گفتگو سننا، اچھے لوگوں میں بیٹھنا، لکھنا اور کتابیں پڑھنا، میری روزمرہ کی زندگی میں شامل ہے۔

ملبوسات:

قمر جمالی سادہ اور انکسار المزاج خاتون ہیں۔ بہت سادہ ملبوسات زیب تن کرتی ہیں۔ سوت اور ریشم بہت پسند ہیں۔ مگر کبھی کبھار وہ قیمتی ساڑیاں کسی مخصوص موقع پر پہنتی ہیں۔ قمر جمالی آرائش وزیبائش کا خاص خیال نہیں رکھتیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کی والدہ نے ان کی اس طرح کی تربیت کی ہے۔ زیورات میں وہ قیمتی پتھر پہننا پسند کرتی ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے اپنے پسندیدہ لباس اور زیورات کے بارے میں بتایا:

''میں ایسے عہدے پر تھی جہاں مجھے آرائش وزیبائش کا خیال رکھنا زیب نہیں دیتا تھا۔ دوران ملازمت میں نے ہاتھ بھر چوڑیاں کبھی نہیں پہنیں۔ مجھے بیضوی رنگ دل کو بھالیتا ہے۔'' ۲

---

۱ ، ۲ شخصی انٹرویو، انٹرویو رجاوید احمد شاہ، ۱۱/اپریل ۲۰۱۶ء ، پیر شام ۴۶:۵ بجے۔

نظم و نسق کی عادی:

قمر جمالی مشہور و معروف ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اصول پسند اور نظم و نسق کی پابند خاتون بھی ہیں جوان کے تشخص میں اور بھی زیادہ نکھار پیدا کرتا ہے۔ اپنے پیشے کے نظم و نسق کو بحسن و خوبی اس طرح سے نبھایا کہ وہ ان کی زندگی کا معمول بن کے ان کی گھریلو زندگی میں بھی اپنی تاثیر چھوڑ گیا۔ آج ایک دہائی کے ریٹائرمینٹ کے بعد بھی وہ گھر کے چھوٹے بڑے کاموں کو شیڈول کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔ ہر چیز کو نہایت قرینہ سے رکھنا پسند کرتی ہیں اور دیگر افراد خانہ کو بھی اصولوں پر چلنے کی بار بار تلقین کرتی رہتی ہیں۔ قمر جمالی کے مطابق:

> ''میں بہت ہی strict officer تھی۔ وقت کی پابندی میرے لیے اہم ہے۔ میں اپنے assistants کو وقت پر آنے اور وقت پر جانے کی تلقین کیا کرتی تھی۔ ہاں اگر درمیان میں کوئی کام آ گیا تو میں important files اپنے میز پر رکھنے کو کہتی تھی۔ گھر میں بھی میں سخت رہی ہوں۔ نظم و نسق کے معاملے میں بچوں کو بھی میں discipline میں رہنے کی تلقین کرتی ہوں۔ عورت کو discipline میں رہنا بہت ضروری ہے۔ عورت کئی رشتوں میں جیتی ہے۔ ایک عورت اگر نظم و نسق کی عادی ہو تو پورا گھر disciplinized ہوتا ہے۔ اگر عورت میں discipline نہ ہو تو وہ گھر بے معنی ہے۔''[۱]

۱؎ شخصی انٹرویو، انٹرویور جاوید احمد شاہ، ۱۱/ اپریل ۲۰۱۶ء، پیر شام ۵:۴۶ بجے۔

قمر جمالی بحیثیت بیٹی/ بہن:

قمر جمالی کے والدین کے ہاں تین بیٹیاں ہوئیں۔ان میں سےقمر جمالی سب سے بڑی بیٹی ہیں۔گھر میں سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے ان پر بڑی ذمہ داریاں بھی آن پڑیں اور وہ ان ذمہ داریوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوئیں۔وہ اپنے والدین کی فرماں بردار بیٹی ثابت ہوئیں۔جس وقت قمر جمالی کے والدصاحب کا انتقال ہوا۔ انہوں نے انہیں دنوں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔بڑی بیٹی ہونے کے باعث نہ صرف ان کو اپنی پڑھائی کا خیال رکھنا تھا بلکہ اپنی ماں اور بہنوں کو بھی دیکھنا تھا۔انہوں نے بڑی دلیری سے اپنی ماں اور اپنی بہنوں کا خاص خیال رکھا۔اپنی بہنوں کو دونوں یعنی دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ کیا اور خود بھی اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہوئیں۔وہ ہمیشہ سے اپنی بہنوں کو مشفقانہ نگاہوں سے دیکھتی رہیں اور ان کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کیا۔وہ بڑی متانت اور شائستگی سے اپنی بہنوں کو سمجھاتی ہیں، لہجے سے نصیحت آموز باتیں ہمیشہ سے میٹھے چشمے کی طرح نکلتی ہیں جو دلوں کو ایک دم موہ لیتی ہیں۔اس تناظر میں قمر جمالی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’آسان نہیں ہوتا ایک سولہ سترہ سالہ لڑکی کا اچانک سے سرپرست بن جانا مگر اپنی ماں کی رہبری میں، میں نے یہ مرحلہ بڑی آسانی سے سر کیا۔اس تگ و دو میں، میں نے اپنی زندگی کا موسم کھو دیا۔میں نے دو ہی موسم جیئے بچپن اور بزرگی والا۔میری دوسری بہن بھی ماشاﷲ خوب پڑھی، تیسری اور چھوٹی بہن بہت ذہین تھی۔اس نے اردو ادب میں ماسٹرس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ایم۔فل۔کیا۔بی ایڈ کیا، جس کے بل بوتے پر اسے سرکاری فوقانیہ مدرسے میں ملازمت مل گئی مگر عمر نے

وفانہ کیا۔عین جوانی میں دل کے عارضے سے ۲۰۰۶ء میں چل بسی۔اس کی موت میرے دل کی رہی سہی تری بھی اڑا گئی۔میں نے اپنے والد اور والدہ کی موت کا صدمہ برداشت تو کرلیا مگر اس کی موت آج بھی میری آنکھوں کے آگے تازہ ہے۔بالکل ابھی ٹھہرے لمحہ کی طرح۔نہ وقت گزرتا ہے اور نہ وہ منظر نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔میرا دل قبرستان بن گیا۔'' [۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر خزاں کے بعد بہار لازمی ہے اور ہر کامیابی کو مشکلات ومصائب کی راہوں سے گزر کر ہی منزل کا حصول ہوتا ہے اور یہ کہ انسان وقت کے ساتھ ہی کچھ کھوتا اور کچھ پاتا ہے۔ان سب چیزوں کے علاوہ محبت ایک ایسی لازوال چیز ہے جو اپنوں کے احساس کو ہمیشہ کے لئے تابندگی عطا کرتی ہے۔

بحیثیت بیوی:

بیوی ایک عظیم رشتے کا نام ہے،جس کے بغیر زندگی ادھوری تصور کی جاتی ہے۔یہی بیوی جب نیک،اخلاق وکردار سے متصف ہوتی ہے تو زندگی جنّت کی مہک کی مانند ہوجاتی ہے۔اخلاق وکردار کے ساتھ ساتھ جب بیوی میں عالمانہ تدبّر اور تفکر ہو تو یہ عظیم رشتہ اور بھی زیادہ استوار ہوجاتا ہے۔

---

[۱] شاعر،بمبئی (عالم یوم خواتین کے نام) مارچ ۲۰۱۵،ص ۱۷

قمر جمالی کی شخصیت کا اگر بحیثیت بیوی تجزیہ کیا جائے تو ان کی زندگی کا پیمانہ ہر لمحہ احساس خودی اور احساس فرماں برداری سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔ جہد و جگر کاوی نے زندگی کے اوراق کو اس طرح سے ان پر مترشح کیا کہ ہر آنے والے وقت کی گتھیاں خود بہ خود سلجھ گئیں۔ قمر جمالی ایک وفا شعار اور فرماں بردار بیوی ہیں انہیں ہر وقت اس بات کا خیال رہتا ہے کہ آیا ان کے رفیق حیات کسی چیز کی طلب تو نہیں رکھتے۔

قمر جمالی نے ملازمت اور ازدواجی زندگی میں میانہ روی اختیار کی اور اپنے ازدواجی فرائض کے ساتھ ساتھ حقوق منصبی کا بھی پورا لحاظ رکھا۔ وہ کبھی بھی اپنے رفیق حیات کے تئیں چیں بہ جبیں نہ ہوئیں بلکہ متبسم ہو کے اپنے شوہر کے روبرو رہتی ہیں۔ قمر جمالی اور ان کے نصف بہتر میں ایک چیز بہت ہی خاصیت کی حامل ہے اور وہ یہ کہ دونوں کی زندگی میں ایک ادبی چاشنی اور اشتیاق بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ شادی کے بعد یہ چیز اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے کہ دونوں میاں بیوی کے خیالات میں یکسانیت ہو اور یہ نعمت بھی قمر جمالی اور ان کے نصف بہتر میں بہ حسن و خوبی موجود ہیں۔ محمود حامد قمر جمالی کو بحیثیت بیوی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ’’قمر بحیثیت بیوی Perfect بیوی ہیں۔ تمام باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ جو بھی میری ضروریات ہیں، ان کو وہ بخوبی انجام دیتی ہیں۔ قمر اچھی مصنفہ کے ساتھ ساتھ اچھی بیوی بھی ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں ہماری شادی ہوئی آج تک ہم میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ قمر بیانیہ کہانی لکھتی ہیں اور میں Abstract۔ اس کے باوجود بھی ان کی کہانی کا پہلا قاری اور

مبصر میں رہتا ہوں اور میری ہر کہانی کی پہلی قاری اور مبصر وہ رہتی ہیں۔ ہم لوگ اپنے گھر میں ہی اپنی چیزوں کی تنقید کر لیتے ہیں، تبصرے کر لیتے ہیں کچھ خامیاں ہوتی ہیں تو اسے دور کر لیتے ہیں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ بیوی شوہر سے تھوڑا آگے چلی جائے تو شوہر کو Jealousy ہوتی ہے، مجھے نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ترقی میں میری ترقی مضمر ہے۔"[1]

بحیثیت ماں:

ماں اللہ کی عظیم اور شفیق تخلیق ہے اور اس لفظ میں اللہ نے محبت اور شفقت کا ایک عالم بھر دیا ہے۔ ماں کے بارے میں حضورؐ نے اسی لیے فرمایا ہے کہ جنّت ماں کے قدموں تلے ہے۔ محبت اور شفقت ہر ماں کی سرشت میں داخل ہوتی ہے۔ جو ماں علم کے زیور سے آراستہ ہو اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ تمام اوصاف سے متصف ہو تو گھر کو جنت نما بنا دے گی اور ایسا ہی کچھ قمر جمالی کا معاملہ ہے۔ قمر جمالی اپنے بچوں کی خوشیوں کا ہر وقت لحاظ رکھتی ہیں۔ ان کے سکھ دکھ میں شریک ہوتی ہیں اور انکے دکھوں کو حتی الامکان سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں کیونکہ وہ چاہتی ہیں کہ زندگی میں جن سنگلاخ راہوں سے انہیں گزرنا پڑا ہے وہ ان کے بچوں کو ہرگز نہ جھیلنا پڑے۔ وہ ہر وہ خوشی انہیں میسر کرنا چاہتی ہیں، کبھی جنہیں وہ زندگی سے دامن پھیلا کے مانگا کرتی تھیں۔ اس چیز کا لحاظ

---

[1] شخصی انٹریو، انٹریور جاوید احمد شاہ، ۱۱/اپریل ۲۰۱۶ء، بروز پیر شام ۶ بجے۔

رکھتے ہوئے وہ اپنے بچوں کو عنایتوں اور مہربانیوں کے گہوارے میں پروان چڑھانا چاہتی ہیں تاکہ انہیں ہر وہ خوشی میسر آجائے جو بچپن میں انہیں نصیب نہ تھیں۔اسی لئے وہ بچوں کی خوشی کو اپنی ہر خوشی پر مقدّم سمجھتی ہیں۔

بحیثیت دوست:

دوستی ایک عظیم رشتہ ہے جو انسان خود بناتا ہے اور خود نبھاتا ہے۔دوستی میلانِ روح کی ایک صورت ہوتی ہے۔قمر جمالی بھی اس عظیم اور مقدس رشتے کو بہت ہی خلوص سے نبھاتی ہیں۔بحیثیت دوست قمر جمالی وفادار،غمگسار اور چارہ ساز ہیں۔قمر جمالی کا اپنے دوستوں کے ساتھ مخلصانہ اور ہمدردانہ برتاؤ رہتا ہے۔قمر جمالی کے ایک قریبی دوست نورالحسنین صاحب راقم الحروف کے ساتھ ایک انٹرویو میں قمر جمالی کی دوستی کے بارے میں اپنی آرا کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> ''دوست تو وہ بہت اچھی ہے۔کردار بھی بہت اچھا ہے، وہ عمدہ اخلاق کے ساتھ ساتھ ایک مخلص خاتون ہے۔محبت وعزت ان کی فطرت میں داخل ہے۔ان سے کبھی ملو تو ان کے اندر ایک گھریلو خاتون بھی موجود ہے۔ان میں انا نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ایک زمانے میں میری بیٹی حیدرآباد میں MBA کر رہی تھی تو میں اکثر حیدرآباد آتا جاتا تھا تو ان کی بہت خواہش رہتی تھی کہ میں ان کے پاس ٹھہروں''۔[1]

---

[1] شخصی انٹرویو،۱۵/اپریل ۲۰۱۶ء، بروز سنیچر شام ۶ بجے، بمقام ہومینیٹیز بلاک یونی ورسٹی آف حیدرآباد۔

چونکہ قمر جمالی ایک اعلیٰ آفیسر، پڑھی لکھی خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ادب دوست بھی ہیں۔اس وجہ سے ان کے دوست بھی ان سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔قمر جمالی کے دوست مذہب، ہمدرد اور غمگسار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے اخلاق بھی رکھتے ہیں۔دوستی نبھانے میں قمر جمالی بے مثال ہیں اور رشتوں کا لحاظ کرنا بھی ان کی فطرت میں شامل ہے۔زندگی کے ہر مرحلے میں وہ اپنے دوستوں کا ساتھ نبھاتی ہیں۔ان کے سکھ دکھ میں شریک ہونا، ان کے لیے بھی وہی پسند کرنا جو وہ خود کے لیے پسند کرتی ہیں، ان کی ہر ضرورت کو پورا کرنا، ان کی عزت کا خیال رکھنا فرض عین سمجھتی ہیں۔

مہمان نوازی:

دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ قمر جمالی ایک اچھی مہمان نواز بھی ہیں۔مہمانوں کو کھلانا پلانا ان کی فطرت میں داخل ہے۔وہ کھلے دل سے گھر آئے مہمانوں کی خاطر داری کرتی ہیں۔قمر مخلص میزبان ہونے کے ساتھ ساتھ فراخ دل اور اچھی مہمان نواز بھی ہیں۔یسین احمد نے قمر جمالی کی مہمان نوازی کا اعتراف یوں کیا:

> ''قمر جمالی گھر گرہستی چلانے میں بھی ماہر ہیں۔ایک مخلص میزبان بھی ہیں، خاکسار کو ایک دفعہ ان کی قیام گاہ پر کھانا کھانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ بڑے ہی مخلص انداز میں اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات کرتی رہیں۔'' [1]

---

[1] شاعر، بمبئی (عالم یوم خواتین کے نام) گوشہ قمر جمالی، مارچ ۲۰۱۵، ص ۲۱

باب سوم
ناول ''آتش دان'' کا تنقیدی مطالعہ

۱۹۷۰ء کے بعد جبکہ نئے نظریات اور نئے فکری رجحانات خودرو پودوں کی طرح جنم لینے لگے تو ادب بھی ان خودرو فکری رجحانات اورنظریات کی زد میں آ گیا۔ یہ نئے نظریات و رجحانات زیادہ تر مغربی راستوں سے ہمارے ادب میں داخل ہوئے۔اگر چہ ان سے ادب میں موضوعاتی تنوع آ گیا مگران چیزوں سے کما حقہٗ ادب پر منفی اثرات بھی پڑنے لگے اور ادیب حقیقت سے کوسوں دور ہو گیا اور حقیقت نگاری ادب میں دھیرے دھیرے مفقود ہونے لگی۔ادب جو زندگی کا آئینہ دار تھا وہ تعشق زدہ ہو گیا اور ادیب نئے نئے فلسفوں اور نظریات میں الجھ کر رہ گیا۔گردشِ ایام نے پھر سے چرخی گھمائی اور انسان ان نئے تراشے ہوئے لامعنی فلسفوں سے اکتا گیا اور نو حقیقت نگاری neo-realism نے جنم لیا۔

انسان نے عصرِنو میں جو نئے نظریات کے بت تراشے تھے آج اسے لگا کہ یہ بس چوراہوں کی زینت کے سوا کچھ نہیں تو یہ اس بات پر مجبور ہو گیا کہ انسانیت کے درد کو بانٹنے میں ہی اصل ابدیت کا راز مضمر ہے اور ادیب اسکی معراج ہے۔ان نئے تراشیدہ فلسفوں اور نظریات کی وجہ سے نئی سیاسی سفاکی، جابر حکومت، غریبوں کا استحصال اور نئی عامریت نے جنم لیا۔مگر دورِ حاضر میں ادیبوں نے اپنے قلم کے ذریعہ احتجاج کیا اور ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھائی، انہیں میں ایک نام قمر جمالی کا بھی ہے۔قمر جمالی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔وہ ۱۹۶۹ء سے افسانے لکھ رہی ہیں اور اب تک ان کے کئی افسانوی مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ان کے ادبی سفر کے آغاز سے متعلق رسالہ ''شاعر'' میں کچھ اس طرح لکھا ہے:

''میری پہلی کہانی کا عنوان تھا ''اے چاند چھپ نہ جانا'' جو ایک ہفتہ

وار پر چہ'' روداد حیات'' کے ادبی ایڈیشن میں چھپی۔اس وقت میری
عمر۱۵سال رہی ہوگی۔لیکن میں اپنے ادبی سفر کا آغاز سنہ۱۹۶۹ءکو مانتی
ہوں۔ ۱۹۶۹ ء میں میرا افسانہ'' فاصلے مٹ گئے'' ماہنامہ' بیسوی
صدی' میں چھپا جو میری زندگی کا turning point ثابت
ہوا۔یہاں سے میری ادبی پہچان شروع ہوگئی'' [1]

افسانے کی مثال اس شعلے کی طرح ہے جو لحظہ بھر کیلئے روشن ہوکر گھپ اندھیاروں کو چیر کر ہر چھپی چیز کو ہمارے سامنے نمایاں کر دیتا ہے حتیٰ کہ باریک سے باریک چیز بھی دکھائی دیتی ہے لیکن اس روشنی کا دائرہ بہت مسدود ہوتا ہے۔اپنے مخصوص دائرے کی وجہ سے اسکی روشنی دور تک نہیں پہنچ سکتی۔لیکن اپنے دائرے کو جس قدر روشن کر دیتی ہے وہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔لیکن ناول ذرا اس سے ہٹ کر ہے۔ناول وہ فلسفیانہ مشغلہ ہے جس میں تعمیریت اور دور اندیشی نمایاں ہوتی ہے۔ناول وضاحت وصراحت اور تفصیل کا آرٹ ہے جبکہ افسانہ باریک اور ہلکے پھلکے اشاروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر افسانہ نگار اچھے ناول نگار نہیں بن پاتے ہیں اور اچھے ناول نگار افسانے کی مخصوص خوبیوں کو مشکل سے نباہ پاتے ہیں۔لیکن قمر جمالی ان تخلیق کاروں میں گردانی جا سکتی ہیں جنھوں نے ان دونوں فن پاروں کے تئیں حق ادا کیا ہے۔قمر جمالی نے'' آتش دان'' لکھ کر اپنی تخلیقیت اور فنی بصیرت کا مسلّم ثبوت ادبی دنیا کو فراہم کیا ان کے ناول'' آتش دان'' میں تقریباً تمام

---

[1] شاعر بمبئی (عالمی یوم خواتین کے نام)، گوشہ قمر جمالی، مارچ ۲۰۱۵ء، ص۱۴۔

خوبیاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔

قمر جمالی نے جس ماحول اور تہذیب میں جنم لیا ہے وہاں کی فضا میں اشترا کی خنکی جنم جنم سے پھیلی ہوئی ہے اسلئے انھوں نے اپنی تحریروں میں جنسی رویوں سے اجتناب کیا ہے۔ اگر ہم ان کے فن پارے کا باریک بینی سے مطالعہ کریں تو ایک نظریاتی کشمکش کی آمیزش اس کے پس منظر میں دکھائی دے گی۔ قمر جمالی نے اپنے پیشرو خواتین تخلیق کاروں سے اپنی راہ الگ نکالی اور عورت ہونے کے باوجود تانیسیت پر زیادہ زور نہیں دیا بلکہ فن کو زیادہ اہمیت دی۔

اکثر خواتین یا تو feminism کا شکار ہو گئی ہیں یا نفسیاتی رجحان ان کے فن پاروں پر غالب نظر آتا ہے۔ اگر ہم قراۃ العین حیدر کے فن پاروں کو غور سے پرکھیں تو اس میں عام فہم اور عام قاری کے لئے دل کو مسخر کرنے والی کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ قراۃ العین حیدر کے ناول اگر چہ فنّی طور پر لاجواب اور اپنی مثال آپ ہیں لیکن جو ان کے اسلوب کا رویّہ ہے وہ عام قاری کے سر سے اوپر گزرتا ہے۔ پر اثر پیغام وہ ہے جو سینے کو چیر کر قاری کا دل موہ لے۔ بقول عبدالحق حسرت:

> ''ہمارے ہاں جو لوگ یورپ کی تقلید میں ناول نگاری کو فنکاری کا میدان بنارہے ہیں وہ شاید یہ بات بھول گئے ہیں کہ تکنیک ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ ادب کا مقصد دلکشی اور دلچسپی کے علاوہ پڑھنے والے کو متاثر کرنا ہے اور اس کے لئے جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں وہ فن یا تکنیک کہلاتے ہیں ایسی صورت میں ظاہر ہے پرانے اور فرسودہ طریقوں کو ختم کر کے نئے طریقے اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی

ہے۔ان طریقوں اور نظریوں کا مقصد، مقصد کے حصول سے ٹکرانا نہیں
ہے۔اگر یہ طریقے اور نظریے مقصد کے حصول تک نہیں پہنچ پاتے تو
سمجھئے تمام محنت رائگاں گئی کیوں کہ ان پڑھنے والوں میں جو لوگ بڑی
محنت اور توجہ سے پڑتے ہیں انہیں دکھاوا ہی سمجھتے ہیں۔ہمارے اس
دکھاوے میں قراۃ العین حیدر نے پناہ لی اور ان کی پیروی میں یہ دکھاوا
اب عام ہونے لگا ہے۔'' [۱]

ڈاکٹر احسن فاروقی کا یہ جملہ کہ:

''قراۃ العین حیدر انٹلکچول نمائش کی طرف بڑھ کر اپنے فن کی لگام
اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہیں۔'' [۲]

علاوہ ازیں اگر ہم عصمت چغتائی کو لے لیں تو اچھی فنکارہ ہونے کے باوجود ان کا اسلوب جنس زدہ ہو گیا ہے۔وہاں فکر اور اسلوب سے زیادہ مقدّم جنس ہے۔مثال کے طور پر عصمت چغتائی کا ناول ٹیڑھی لکیر اگر چہ اردو ناول نگاری میں ایک اہم اضافہ ہے لیکن اس میں جنسی رجحان کی جو فراوانی ہے وہ ان کی مقبولیت میں سخت رکاوٹ بن جاتی ہے۔لیکن 'آتش دان' اپنے اسلوب کے لحاظ سے بھی اور فنی نقطہ نگاہ سے بھی کامیاب اور مقبولیت کے مراحل کو طے کر کے قاری کے دل کو مسخر کر لیتا

---

[۱] دیپاچہ ''آنگن''، از عبدالحق حسرت، ص ۱۶۔

[۲] ناول کیا ہے؟ ص

ہے۔

'آتش دان' بہت ہی سہل اور آسان زبان میں لکھا گیا ہے جس میں وقت کے فلسفے کو ایک لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اشاروں کنایوں میں زندگی کے فلسفے کو سمجھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

''زندگی کی رفتار بھی کتنی نرالی ہے ____ ____!

جتنی خاموش _____ اتنی ہی تیز گام ___!!''[1]

وقت کے ساتھ ساتھ ہمیں اس ناول میں بہت سے ایسے مسائل ملتے ہیں خاص کر جو ہماری سیاسی دنیا سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ SVF اور دیگر مظلوم افراد اشترا کی تہذیب کے نمایاں کردار اس ناول میں پیش کئے گئے ہیں جو ظلم کی چکی میں پس کر فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں اور ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

قمر جمالی کا یہ پہلا ناول ہے۔ اب تک انہوں نے صرف افسانوی ادب تخلیق کیا ہے۔ اصولی طور پر اس ناول میں افسانوی رنگ زیادہ ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے اس میں ایک نئے موضوع کو جگہ دی۔ گاؤں کے کسانوں کی مظلومیت، انانیت اور سیاسہارے کی غنڈہ گردی دولت اور قبیلے کے بل بوتے پر ڈکٹیٹر شپ کی چکی میں پسے ہوئے عام انسان کو موضوع بنایا

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۳۲۔

ہےاور جس کی روشن مثال میر مدار ہے۔میر مدار کا کردار عصر نو کے جابر اور ظالم لوگوں کے لئے ایک انتباہ ہے کہ خاموشی اور بیچارگی کا لاوا جب پھٹنے لگتا ہےتو بڑی سے بڑی سلطنت کی کایا پلٹ سکتی ہے اور جب جوشِ جنوں حد سے تجاوز کر لیتا ہے تو ہوش والوں کی عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔'آتش دان' خاص کر ان تخلیق کاروں کے لئے سبق ہے جو محض جنس نگاری ہی کو ناول نگاری سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے بھی جن کے ناولوں میں 'مثلث' ہوتے ہیں۔ایک ہیرو ایک ہیروئن ایک ولن۔الغرض اس ناول میں قمر جمالی کا فنّی شعور، ذہانت، تخلیقی صلاحیتیں اور قوت مشاہدہ ایسا ہے جو ہمیں بار بار انہیں داد دینے پر مجبور کرتا ہے۔شمس الرحمان فاروقی نے''آتش دان'' کے بارے میں اپنے رویّہ کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے:

''موضوع کے اعتبار سے یہ مجھے بالکل نیا ناول معلوم ہوا۔گاؤں کے کسانوں کی مظلومیت، مقامی غنڈہ گردی اور سیاست اور حکومت کے جوڑ توڑ کو خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ناول کا پلاٹ اگر چہ مربوط ہے مگر بیان کی کمزوری، مکالموں کی تکرار اور مناظر کی یک رنگی اس کے فطری بہاو میں خارج ہوتے ہیں۔لفظ گیٹ کو انہوں نے ہر جگہ مونث لکھا ہے بہتر ہے کہ انہیں اگلی اشاعت میں درست کر لیا جائے۔ان باتوں کو نظر انداز کر دیں تو ناول اچھا ہے اور دلچسپ یقیناً ہے۔بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایک نئے موضوع کو فکشن کے حیطے میں لاتا ہے۔'' [۱]

---

[۱] شب خون خبر نامہ، جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء، ص ۲۴

قمر جمالی بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں لیکن ناول کے فن میں بھی انہوں نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ ہر کوئی اس بات سے بخوبی واقف ہوتا ہے کہ ہر فنکار کے فن میں اس کی شخصیت کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی پہلو سے اجاگر ہو کر رہتی ہے چاہے وہ شاعری ہو افسانہ ہو یا پھر ناول۔شخصیت کا اظہار بہر حال ہر فن میں دکھائی دیتا ہے اور یہ ہونا بھی چاہیئے۔شخصیت اور دلی جذبات کے اظہار کا نام ہی فن کہلاتا ہے۔قمر جمالی چوں کہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہی ہے اس لئے ان کے اس ناول میں بھی ایک اعلیٰ افسر ناول کا مرکزی کردار ہے۔ جو اسی محکمے سے تعلق رکھتا ہے جس محکمے میں قمر جمالی نے اپنی زندگی کے ۲۸ سال وقف کیے۔

آتش دان ۲۵۳ صفحات اور ۳۲ چھوٹے چھوٹے ابواب پر مشتمل ایک انقلابی ناول ہے۔ناول کا انتساب مصنفہ نے اپنے والدمحترم کے نام کیا ہے۔ناول ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، سے مارچ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔آتش دان کا بیرونی حصہ قاری کو جاذب نظر بناتا ہے اور جتنا خوبصورت اس ناول کا باہری پہلو ہے اتنا ہی اس کا اندرون قاری کے ذہن و دل کو متاثر کرتا ہے نیز یہ کہ اس ناول سے انسان کا اندرونی آتش دان جو ہر انسان کی سرشت میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے وہ ہر آن جلتا رہتا ہے۔

''آتش دان'' کی شروعات قمر جمالی نے ایک نثری نظم سے کیا ہے جس میں زندگی اور وقت باہم متصادم نظر آتا ہے اور وقت ہر چیز اور ہر شئے کو عبور کر کے انسان کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے جس میں انسان بہت سے مراحل اور مشکلات و مصائب سے گزر کر زندگی کی باریک حقیقتوں سے آشنا ہوتا ہے جو اس کی زندگی کو تجربہ خیز بناتی ہے۔نظم اس پیرائے سے بُنی گئی ہے کہ ہر لفظ میں زندگی کی کشمکش کا درد

چھپا ہوا ہے۔ نظم کا لہجہ کچھ اس طرح سے ہے:

مجھے معلوم ہے
میں نے سفر کی ابتدا کی ہے
میرے تلووٴں نے دیکھا ہے
زمیں کا سخت ہو جانا
مخالف سمت سے چلنا ہواؤں کا
مگر۔۔۔۔
میں جانتی ہوں
جو جنا لفظوں سے گا ہے
گا ہے اوڑھنا ماضی کے قصّے
مجسّم نقش فریادی کی صورت
رقم کرنا خودی کو اور فنا کو مات دینا
یہی ہے زندگی ______ پائندگی ہے [1]

اقبال نے بھی فلسفہ وقت کو بڑی باریکی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ:

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب، صیرفئ کائنات

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص۴۔

یہ کہ وقت دنیا کی سب سے بڑی کسوٹی ہے ہر چیز، ہر شئے اور ہر انسان کو پرکھتا ہے، حق اور باطل کو الگ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس پتھر کی مانند جس پر سونا پرکھا جاتا ہے۔ من وعن ویسے ہی انسان کا کام صرف جدوجہد میں مصروف رہنا ہے باقی اس سے کیا حاصل ہو جائے یہ وقت ہی بتا دیتا ہے۔ انسان کا کام صرف اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے جیسے کہ سورۃ الانعام (۱۶۶ آیت) کا ذکر اس ناول کی ابتدا میں کیا گیا ہے۔

ترجمہ: ''اور اسی نے تم کو خلیفہ بنایا زمین پر اور بلند کر دئے تم میں درجے
ایک کے ایک پر تا کہ آزمائے تم کو اپنے دئے ہوئے حکموں میں۔''

ہر انسان زمیں پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ ان میں بعض کو بعض پر فوقیت عطا کی گئی ہے تا کہ آزمایا جائے۔ یہاں فوقیت سے مراد صلاحیت اور علم ہے۔ ان صلاحیتوں اور علم کو بھرپور استعمال میں لانا ہی اس امانت سے عہدہ برآ ہونا ہے۔

موضوع:

قمر جمالی نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے اس سے ان کی تعمیریت کا جذبہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ قمر جمالی اس ناول میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

''بہت دنوں سے ہمارے ذہن میں ایک خیال کلبلا رہا تھا کہ ناول لکھا
جائے۔ ذہن میں ایک خاکہ تھا۔ اپنے (۳۵) سالہ تجربوں کا
نچوڑ۔ آنکھوں دیکھا بھی ______ اور عملاً جیا ہوا بھی۔
لکھنا شروع کیا۔ گزرے شب و روز دستہ بستہ وارد ہونے لگے۔ ناول

بہت جلد مکمل ہو گیا۔

مگر ______

اپنی عادت کے مطابق اسے ایک قاری ______

ایک ناقد کی نظر سے پڑتے ہوئے وقت لگ گیا۔'' [1]

مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ یہ ناول مصنفہ کی زندگی کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ اپنی ملازمت کے دوران کے واقعات کو جن کی مصنفہ خود چشم دید گواہ بھی ہے اور کچھ پر تو ان کی زندگی پر بھی پڑا ہے۔

''آتش دان'' موضوع کے لحاظ سے ترقی پسند نظریے کا حامل ہے اگر چہ ناول کی شروعات داستانی انداز سے ہوتی ہے مگر اس کا مرکزی خیال جس کے ارد گرد یہ ناول گردش کر رہا ہے وہ مظلوم عوام پر ڈھائے ہوئے ستم ہیں۔ جس کے مناظر اس ناول میں بڑی روشنی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ ظلم کی بھٹی جب معصوم عوام کے لئے تیار کی جاتی ہے تو وہاں سے مظلوم عوام جل کر نہیں بلکہ پختگی اور عزائم کے ساتھ نکلتے ہیں جن کے دلوں میں ایک سوزش اور شورانگیزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہے۔ یہ شورش اور سوزش انہیں اس قابل بناتی ہے کہ بڑی سے بڑی سلطنت کا تختہ پلٹ سکتی ہے۔ وہ خود اپنے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

''یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کہانی اپنے اسٹیج کے لوازمات خود
ہی پورے کرتی ہے ہم لکھتے گئے۔ ایک عام آدمی کے دن ورات، جب

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۷

وہ موجودہ سماج کے سسٹم سے ٹکراتا ہے۔ بیروکریسی کی بداحساسی اور
مٹھی بھر طاقتور لوگوں کی بے رحمی۔

اور ______

ایک عام آدمی کی بے بسی اور انصاف اور ترحم کی متقاضی اس کی فریاد
بھری نظریں۔اس ناول کو لکھتے ہوئے ہمیں بڑے عجیب تجربے ہوئے
کیوں کہ اس میں کچھ کہی ان کہی داستانیں سچ اور جھوٹ کے بیچ حیرت
سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور بند ہونٹوں کے درمیان گویم نہ گویم حقیقتیں رقم
ہیں۔یہ سچ ہے کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا مگر چٹ پٹا کر آواز تو کرسکتا
ہے۔بھڑ بھونجے کو اپنی طرف تو متوجہ کرسکتا ہے۔دراصل یہ بھڑ بھونجا ہی
اس سسٹم کا کلید بردار ہے۔'' [1]

مظلوم عوام کی مثال اس جوالے کی طرح ہے جو خاموشی سے زمین کی تہوں سے دن رات گزرتا رہتا ہے مگر جب اس پر pressure آجاتا ہے تو یہ خاموشی لاوے کی شکل اختیار کرکے تباہی مچا دیتی ہے۔مذکورہ ناول میں بھی وہی لوگ موضوع بحث بنے ہوئے ہیں جو خاموشی سے ظلم سہتے رہتے ہیں مگران کے اندر کے لاوے جب بھڑک اٹھے تو 'میر مدار'اس چھپے لاوے کے لئے ایک راستے کا کام فراہم کرتا ہے جہاں سے یہ لاوا SVF کی شکل میں پھٹ کر راجیشور ریڈی کی انانیت اور سلطنت کے چیتھڑے اڑاتا ہے۔

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص،۸۔

آتش دان زندگی کے رزمیہ ہی کو پیش نہیں کرتا بلکہ رزمیہ کے ساتھ ایک نظریہ اور فلسفہ کو بھی پیش کرتا ہے۔ یہ ناول ایک مزدور کے روزمرہ اور اس کی عام زندگی جو اسی کشمکش میں گزر جاتی ہے کہ کب اس کا نفس روٹی کے ٹکڑے سے سیر ہو جائے۔ ناول میں ایک خاص قبیل کے افراد کے ارد گرد قصہ کا تانا بانا بنا گیا ہے اور اسی طرح کے کردار اس میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ اگر چہ یہ ایک مشکل کام تھا مگر مصنفہ کی جہد و جگر کاوی نے اسے سہل ثابت کیا۔ مصنفہ ایک جگہ اس بات کا اعتراف اس طرح کرتی ہیں:

''یہ کام مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں۔
کیونکہ ــــــ
حقیقتوں اور صداقتوں کا اظہار کوئی آسان بات نہیں ہے ـــــــــ
سچ تو یہ ہے کہ آرٹ، معروضی حقائق کے اظہار کی خلقی صورت اور حقیقتوں کی تلاش کا ایک واحد مقصد بھی رکھتا ہے۔ یہ تلاش و جستجو صرف باہر کی دنیا تک محدود نہیں رہتی بلکہ خود مصنف کے درون میں بھی جاری رہتی ہے۔ ایک سنجیدہ اور باشعور قلمکار، حقیقتوں کا صرف غیر متحرک تماشائی نہیں ہوتا بلکہ اس کا تمام تخلیقی تجربہ اس کے عہد کی ایک جامع دستاویز بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ غصّہ اور نفرتوں کا لاوا بھی انڈیلتا ہے تو صرف کثافتوں کا لاوا نہیں بنتا، بلکہ آرٹ کا حسن جمالیاتی سطح پر ابھر کر ایک فن پارہ بن جاتا ہے۔''[1]

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۹/۸۔

موضوع کے لحاظ سے اگر چہ قمر جمالی کا یہ ناول نیا معلوم ہوتا ہے مگر اس میں انہوں نے ایک مخصوص طبقے کے مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے اور ہر تکنیک کو بخوبی استعمال میں لایا۔ ناول کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ وہ زندگی کے رزمیہ کو پیش کرے اور یہ بات اس ناول میں موجود ہے۔ مصنفہ نے اس بات کا مسلم ثبوت دیا ہے کہ ہر فنکار کے فن میں اس کی شخصیت کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی پہلو سے اجاگر ہو کر رہتی ہے۔ شخصیت اور دلی جذبات کے اظہار کا نام ہی فن کہلاتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ اس کے علاوہ اس ناول کا خاصہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے لئے جیے اور یہی انسانیت کی معراج بھی ہے۔

طبقاتی ناول:

ناول کو مختلف اقسام پر بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ اقسام باعتبار فارم یا ہیئت ہوتے ہیں مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ایک قسم کا ناول دوسرے قسم کے ناول سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اکثر ایک قسم کے ناول میں مختلف قسموں کی خصوصیات اس طرح ملی جلی ہوتی ہیں کہ اس کو کسی خاص قسم کا ناول نہیں کہا جا سکتا اور شاید ہی کوئی ناول ایسا ہو جس کو کسی ایک خاص قسم کا کہا جا سکے۔ پھر بھی کچھ خاص ناولوں کی ہیئت میں کچھ ایسے صفات ضرور ملتے ہیں کہ ان کو ایک ہی قسم کا کہا جائے اور اس طرح مختلف قسمیں ایسی قائم ہو گئی ہیں جن کے ماتحت ناولوں کو لایا جا سکتا ہے۔

ایک قسم کا ناول واقعات والا یا واقعاتی ناول ہوتا ہے اور یہ سب سے سیدھا ناول ہوتا ہے۔ اس میں محض ایک واقعات کی زنجیر ملتی ہے اور ناول نگار صرف اس اصول کا پابند معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کس طرح ایک دوسرے سے ملا کر بیان کئے جائیں کہ قصہ کی دلچسپی میں اضافہ ہو۔ یہ قسم

ایک طرف تو اس پرانے داستان کے مشابہ ہوتی ہے جس میں واقعات در واقعات قصہ بیان ہوتے ہیں۔ محض واقعات میں دلچسپی بیان کرنا اس قسم کے ناول کا مقصد ہوتا ہے۔ ایک معمولی سے واقعہ سے ایسا ناول شروع ہوتا ہے مگر اس کے نتائج ہر طرف اپنا اثر پھیلانے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ لا تعداد واقعات نمودار ہو جاتے ہیں اور واقعات کا ایک جال بن جاتا ہے، جس کا سلجھنا مشکل بلکہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ الجھاؤ دور ہوتا جاتا ہے اور واقعات سلجھ سلجھا کر ایک خاص ڈھرے پر آتے ہیں اور ناول ختم ہو جاتا ہے۔ اردو میں مولانا عبدالحلیم شرر کے ناول بھی اسی قسم کے کہے جا سکتے ہیں۔ شرر کا کوئی ناول لیجئے مثلاً ''فلورا فلورنڈا'' اس میں کسی کردار کی کوئی اہمیت نہیں فلورا عیسائیت کی دلدادہ ایک طرف اور فلورنڈا عیسائی نن فلورا کے بھائی کو پھانس کر عیسائی بنا لینے کی فکر میں دوسری طرف انہیں باتوں سے تمام واقعات نکلتے آتے ہیں۔

دوسرے قسم کا ناول جو بہت ہی اہمیت کا حامل ہے کرداری ناول ہے۔ اس قسم کے ناولوں میں قصہ کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی اور واقعات کسی خاص نقطہ کی طرف جاتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ اگر کوئی ہلکی سی لہر قصہ کی ہوئی بھی تو تمام کرداروں کو اس سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ کردار قصہ کی جکڑ بندی سے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے واقعاتی ناول میں واقعات سے اہم نتائج نکلتے ہیں۔ کرداری ناول میں واقعات محض کردار کی خصوصیات کا انکشاف کرتے ہیں۔ اردو میں اس قسم کا ناول شرر کا فسانہ آزاد ہے۔ اس میں خوجی کسی جگہ نہیں بدلتا وہ محض ہماری آنکھوں کے سامنے نچایا جاتا ہے تا کہ ہم اس کے سب پہلوں سے واقف ہو جائیں۔

مذکورہ بالا ناول کے اقسام کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے ناول ملتے ہیں جن کا یہاں پر سرسری

ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ڈرامائی ناول،ان ناولوں میں کردار کی خصوصیات واقعات کا سبب ہوتی ہیں اور واقعات کردار کی خصوصیات میں تبدیلیاں پیدا کرتے رہتے ہیں اور اس طرح ناول کے ختم ہونے تک واقعات و کردار ہمدوش چلتے دکھائی دیتے ہیں۔اس کے علاوہ تاریخی ناول، جاسوسی ناول(detective novel)، رومانی ناول،عصری ناول(periodic novel)،فطری ناول جس میں ٹالسٹائی کا نام سرفہرست ہیں کو ناولوں کی اقسام میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور قسم کا ناول ہے جو طبقاتی ناول کہلاتا ہے۔طبقاتی ناول کو ہم سوشل ناول سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔اس طرح کے ناولوں میں مختلف طبقات کی جدوجہد دکھائی جاتی ہے۔یہ ناول اشتراکیت سے بہت زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں۔مقصد خاص طور پر اشتراکیت کا پرچار ہوتا ہے۔ناول ''آتش دان'' بھی اسی قبیل کا ناول ہے جس میں ایک خاص طبقے کی کشمکش کو ایک قصہ کی شکل میں پرودیا گیا۔یہ ناول اگرچہ قصہ سے شروع ہوتا ہے مگر قصہ اس کا اصل مغز نہیں بلکہ اس میں ایک خاص انداز فکر کو سمویا گیا اور یہی انداز فکر اس ناول کو اشتراکی زمرے میں ضم کرتا ہے۔ایک طرف میر مدار اور اس کے ساتھیوں کی ہمہ تن کوششیں اور راجیشور ریڈی کے ڈھائے ہوئے ظلم وستم اور دوسری طرف SVF کی عسکری جدوجہد جو راجیشور ریڈی کے مظالم کا نتیجہ تھی۔عسکری جدوجہد کے بعد جب SVF والوں کو اپنے حقوق مل جاتے ہیں تو ان کے اندر ایک عام آدمی کی طرح جینے کی امنگیں جاگتی ہیں۔جو اس بات کو آشکار کرتی ہیں کہ ان کو بغاوت کیلئے سماج نے مجبور کیا تھا۔اس میں ایک اشتراکی پیغام یہ ہے کہ ہر انسان جب سماج کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے تو وہ فرار کی راہ کا انتخاب کرتا ہے۔مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہوجاتا ہے کہ جب SVF کے نوجوانوں کو اپنے

حقوق مل جاتے ہیں تو وہ ایک عام آدمی کی طرح جینے کے خواہش مند ہوتے ہیں تب جا کے وہ شہباز خان کے آگے surrender کرتے ہیں۔

''مگر سردار کا کہنا ہے کہ سرنڈر آپ کے آگے کیا جائے
کیوں کہ آپ ہی کی وجہ سے ہماری برسوں کی ریاضت بار آور ہوئی ہے۔
اور......ہم نے ہتھیار جس مقصد کے لئے اٹھایا تھا وہ پورا ہو گیا ہے____''
''مگر...... ابھی فیصلے کا انتظار ہے۔ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔''
''وہ آجائے گا۔ معاملہ کھلی کتاب کی طرح صاف ہے۔ ہمیں اس کی فکر نہیں ہے۔ ہمارا مقصد پورا ہوا۔ اب ہم عام شہریوں کی طرح جینا چاہتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور ہمیں سر اٹھا کر جینے کا موقع فراہم کریں گے۔''[1]

قمر جمالی کا ناول 'آتش دان' سوشل ناول کا ایک ادبی شاہکار تصور کیا جانا چاہئے۔ کیوں کہ انہوں نے اس میں فنی خصوصیات کے علاوہ سماجی قدروں کو بھی ابھارا اور طبقاتی کشمکش کو بھی پیش کیا ہے۔

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۲۰۵۔

قصّہ پن:

ناول کا سب سے اہم عنصر قصہ یا کہانی ہے۔ عام طور پر ناول کو محض قصہ ہی سمجھا جاتا ہے اور عام ناول میں قصہ کے سوا کچھ اور ہوتا بھی نہیں مگر اعلیٰ سے اعلیٰ ناول بھی بغیر قصہ کے وجود میں نہیں آسکتا۔ خواہ اس میں قصہ پن بہت ہی ہلکا ہو۔ قصہ ہی ناول کو ناول کہلانے کا مستحق بناتا ہے۔ مسٹر ای۔ ایم فروسٹر نے جو بڑے کامیاب ناول نگار ہیں خوب کہا ہے کہ ''قصہ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے''

قصہ سے لطف اندوز ہونا ہماری فطرت میں داخل ہیں۔ انسان ہمیشہ سے قصہ میں دلچسپی لیتا آیا ہے اور ہمیشہ دلچسپی لیتا رہے گا۔ قصہ کے ساتھ دلچسپی ایک فطری امر ہے اور ہماری فطرت کا ایسا تقاضا ہے جس سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قصہ کی تعریف عام طور سے یوں کی جاتی ہے۔

> ''وہ کچھ ایسے واقعات یا حرکات کا بیان ہے جو یکے بعد دیگرے ظاہر
> ہوئے ہوں اور کسی نتیجے پر پہنچتے ہوں۔''

واقعات یا حرکات کا یکے بعد دیگرے یا ایک وقت کے بعد دوسرے وقت میں ہونا قصہ کی جان ہے۔ ہر قصہ میں یہ بیان ہوتا ہے کہ پہلے یہ ہوا یا پھر یہ، آخر میں نتیجہ یہ ہوا۔ یا یوں کہ فلاں شخص نے پہلے یہ کہا، پھر یہ کہا اور آخر میں یہ ہوا اور اس طرح ہر قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہر قصہ میں ایک شروع کا واقعہ ہوتا ہے، پھر کچھ درمیانی واقعات ہوتے ہیں اور آخر میں کوئی خاص واقعہ جس سے نتیجہ کہنا چاہیئے۔ اس میں وقت کا سلسلہ ایک خاص چیز ہے۔ یعنی اس میں وقت کے حساب سے ترتیب ضروری ہے۔ ہماری زندگی میں ہر بات ایک وقت میں نہیں ہوتی اس لئے ہر قصے میں اوقات کا تعین پھر بعد کے وقتوں یعنی ابتدا، درمیان اور آخر کا التزام ضروری ہے۔ زندگی میں تو اکثر وقت کا شمار نہیں

رہتا مگر قصہ میں اس کا شمار پابندی کے ساتھ بہت ضروری ہے کیونکہ قصہ میں ''پھر کیا ہوا؟'' کا سوال بہت ضروری ہے اور اس کو پورا کئے بغیر قصے کو پر لطف نہیں بنایا جا سکتا۔قصہ میں واقعات کو ایک دوسرے سے باندھنے والا تار کسی وقت ٹوٹنا نہ چاہئے بلکہ یہ تار جتنا ہی زیادہ طویل ہوگا اور واقعات جتنے اچھے گندھے ہوئے ہوں گے اتنا ہی قصہ دلچسپ ہوگا اور اتنا ہی زیادہ اس میں جی لگے گا۔قصہ میں انتظار یا تجسس کی خلش خاص چیز ہیں اور جتنی زیادہ انتظار کی خلش ہوگی اتنا ہی دلچسپ قصہ ہوگا۔ یہی تجسس suspension کہلاتا ہے جو قصہ کی شان ہوتا ہے۔قصہ کو دلچسپ بنانے کا فن نہ ہر شخص کو آتا ہے، نہ ہر شخص سیکھ سکتا ہے، یہ چیز God gifted ہے جو کم لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔

''آتش دان'' کی شروعات بھی قصہ سے ہوتی ہے جو واقعہ در واقعہ آگے بڑھتا ہے اور ایک تجسس بھرا انداز قاری کے لئے فراہم کرتا ہے۔قصہ کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ:

''پھر......

بوڑھے بابا نے اشرفیوں کا ایک توڑا اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور کہا۔

''لڑکے ______ !اصطبل سے جو گھوڑا اچھا ہو نکال لو''اور

''سرپٹ دوڑ نکلو یہاں سے۔''

''مگر دادی ______ !یہ تو بتاتی جاؤ کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا ____ ؟

دادی نے رک کر ایک نظر میری طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے شب بخیر کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔'' [1]

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۱۱

قمر جمالی چونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اسی لئے ان کے ناول ''آتش دان'' میں اس فن کا بھرپور سہارا لیا اور اس فن کا استعمال اس حد تک کیا کہ جن الفاظ سے یہ قصہ شروع ہوتا ہے ان الفاظ کا مفہوم شہباز عمر بھر تلاش کرتا رہا، دادی سے کئی بار کرید کرید کر پوچھنے کی کوشش کی لیکن جواب نہیں ملا۔

''اچھا___ تو بتا کہاں تھی میں _____؟''

دادی نے پلنگ کے سرہانے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا تو میری جان میں جان آئی۔

''وہ____ وہ دادی____''میں سوچ میں پڑ گیا۔

''پھر____ بوڑھے بابا نے____'' میں نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں یاد آیا____''

''پھر...... بوڑھے بابا نے اشرفیوں کا ایک توڑا لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا.......

''لڑکے____! اصطبل سے جو گھوڑا چاہو نکال لو اور سرپٹ دور نکلو یہاں سے۔ [1]

دراصل جملہ ایک ہی ہے مگر اس میں تجسس برقرار رکھنے کیلئے فنکارہ نے اسے بار بار ادھورا چھوڑا۔ مثلاً ''پھر...... بوڑھے بابا نے اشرفیوں کا ایک توڑا لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا'' اس جملے

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۱۷

میں قصہ پن اتنا بھرا ہوا ہے کہ ساری کہانی اسی کے ارد گرد گھوم کر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ واقعات کی لڑیوں کو ایک دوسرے میں اس طرح سے پرویا گیا کہ ہر آنے والا قصہ پچھلے کا جواب معلوم ہوتا ہے۔ ناول کا یہ قصہ دادی کی زندگی کا ایک المیہ ہے۔ دادی کو اندر ہی اندر اس بات کی فکر کھائی جاتی ہے کہ خواب ان کے شوہر نے دیکھے تھے وہ پورے ہونگے یا نہیں۔ دادی کی یہی خواہش اس قصہ کی اہم وجہ ہے۔ مگر فن کارہ نے اس طریقے سے اسے پیش کیا کہ یہ قصہ ادھوری کہانی کا موڑ دھار لیتا ہے اور ایک جذبہ دروں رہ جاتا ہے یہاں تک کہ دادی کا تخت خالی ہو جاتا ہے۔ دادی کے جانے کے بعد بھی یہ جذبہ دروں شہباز کو خوابوں میں بے چین کرتا رہتا ہے اور اس طرح سے قصہ کا تجسس اختتام تک قائم رہتا ہے۔

ناول کی بنیاد اس کے قصہ پن ہی پر قائم ہے جو اس میں دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے اور قاری اکتانے کے بجائے اس کو پورا کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ ''آتش دان'' کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کا قصہ آخر تک قاری کو کتاب کو تھامے رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

پلاٹ:

عام طور پر پلاٹ اور قصہ میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لوگ پلاٹ اور قصہ کو یکساں تصور کرتے ہیں مگر دونوں میں بہت ہی تفرق پائی جاتی ہے چونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ناول پلاٹ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے جیسے سر والٹر اسکاٹ کے ناول قصہ گوئی کی بہترین مثال ہیں مگر وہ پلاٹ سے عاری ہیں۔ ناول کا پلاٹ قصہ کی ترتیب سے تعلق رکھتا ہے مثلاً، راجہ مر گیا، رانی مر گئی۔ اگر ان دونوں جملوں کو اس طرح ملایا جائے کہ راجہ کے غم میں رانی مر گئی تو یہ اکہرا پلاٹ ہے۔ یعنی قصوں کا باہم ربط یا

ایسی کڑی جوقصوں کوآپس میں پرو کے بیان کرے۔ پلاٹ میں بھی واقعات کا بیان ہوتا ہے مگراس میں سبب اورمسبب کے مطابق ترتیب پرزیادہ زورہوتا ہے۔

پلاٹ بنانا ایک قسم کا فنِ تعمیر ہے اوراچھے پلاٹ والے ناول کا ہرحصہ اس طرح تعمیر ہوتا ہے جیسے ایک عمارت الگ الگ حصوں سے تعمیر ہوتی ہے۔مثلاً پہلے عمارت کی بنیاد ڈالی جاتی ہے پھراس کی دیواریں پھراسکی چھت تعمیر ہوتی ہے یہ سب چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہوتی ہیں کہ اگرایک کمزور پڑجائے تو عمارت ڈھیلی بن جائے گی۔اسی طرح اگرکسی کہانی یاناول کا پلاٹ ڈھیلا ہوگا تو وہ کہانی کمزورکہلاتی ہے۔یادرہے کہ ایک کہانی میں کئی پلاٹ بھی ہوسکتے ہیں۔بہ نسبت قصے کے زیادہ تر پلاٹ کی وجہ سے ناول فن کاری کے زمرہ میں شامل ہونے کا مستحق ہوتا ہے۔فن کاری کا پہلا ثبوت پلاٹ کی اچھی ترتیب ہوتی،اس لئے پلاٹ کو قصہ پرزیادہ فوقیت حاصل ہے۔عام ناولوں میں پلاٹ کمزوراورقصہ اچھا ہوتا ہے۔پلاٹ میں قصہ نہایت سلیقہ سے ڈھلنا چاہے۔ پلاٹ بنانا ویسا ہی ہے جسے کوئی بت تراش کچھ خاص فنی قاعدے کے موافق کسی پتھر کی سل کوتراش کرایک خوش نمابت بنائے مگراس میں بناوٹ کا اثر نہ ہوجیسے کسی بت تراش کے بت کا اصل سے مطابق ہونا بھی ضروری ہے جیسے تراشے ہوئے بت میں حقیقت کے ساتھ حسن یا دلکشی ضروری ہے۔ویسے ہی ناول کے پلاٹ میں ایک فنی حسن وخوبی کا وجود لازم ہے۔الغرض پلاٹ کی بناوٹ جتنی زیادہ دل کش ہوگی اتناہی اچھا پلاٹ ہوگا۔

ڈاکٹرانورپاشاناول میں پلاٹ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''ناول کے لیے پلاٹ کا ہونا لازمی ہے بغیر پلاٹ کے کوئی قصہ ربط

وتسلسل اور فنی تنظیم وترتیب کے ساتھ اختتام تک نہیں پہنچ سکتا۔اس تنظیم وترتیب میں فنی حسن کے ساتھ اختتام تک پہنچنے کے لیے پلاٹ لازمی ہے۔غرض کہ پلاٹ ایک فنی سانچہ ہے جس میں واقعات ڈھل کر خاطر خواہ shape اختیار کرتے ہیں،اچھے پلاٹ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں سادگی اور اختصار ہو۔پیچیدگی اور طوالت پلاٹ کی فنی ترتیب میں الجھاؤ پیدا کر دیتی ہے۔اور اس سے وحدت تاثر بھی مجروح ہوتا ہے۔ناول کے پلاٹ کے لیے حقائق پر مبنی ہونا لازمی شرط ہے۔فطری، دلچسپ،مربوط اور متوازن پلاٹ کو بہتر پلاٹ تصور کیا جاتا ہے۔'' [۱]

''آتش دان'' کا پلاٹ مربوط اور سیدھا سادھا ہے۔اس میں واقعات ایک فنی سانچے میں ڈھلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، واقعات کی کڑیاں بھی ایک دوسرے میں پیوست معلوم ہوتے ہیں اس میں دادی جو اپنے پوتے شہباز سے بہت پیار کرتی تھی اس سے ایک دن ایک کہانی سناتی ہے کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے:

''پھر......

بوڑھے بابا نے اشرفیوں کا ایک توڑا لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا۔

''لڑکے ____! اصطبل سے جو گھوڑا چاہو نکال لو اور سرپٹ دوڑ نکلو یہاں سے۔''

مذکورہ بالا الفاظ کا مفہوم شہباز خان تمام عمر تلاش کرتا رہا، دادی سے کئی بار کرید کرید کر پوچھنے

---

[۱] انور پاشا، ہندو پاک میں اردو ناول،۱۹۹۰ء،ص ۹۵۔

کی کوشش کی لیکن جواب نہیں ملا۔دادی جوشہباز کے لئے ایک آئیڈیل تھیں،جن سے وہ اپنی جان سے زیادہ پیار کرتا تھا،اکثر ان کی فلسفیانہ باتوں کو نہ سمجھ پاتا،رفتہ رفتہ وقت گزرتا رہااورشہباز پڑھائی کرتا رہا،جیسے ہی پڑھائی ختم کی اسے تحصیلدار کا عہدہ مل گیا۔دادی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس نے دادی کےخواب کو پورا کیااوراس کے دادا کےنقش قدم پر چلنے لگا کہ وہ بھی اسی عہدے پر فائز تھے، دادی نے شہباز کونصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا تو کوشش کر کے سورج پورضرور اپنا تبادلہ کرا لینا کہ وہاں تجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔تیرے دادابھی وہیں تھے،دادی سےاس نے کئی باراصرار کیا کہ وہ دادااورسورج پور کے بارے میں کچھ بتائےلیکن دادی ہمیشہ ٹالتی رہیں اور وہ دادی سے کچھ نہ اگلوا سکا کہ دادی کا تخت ہمیشہ کے لئے خالی ہوگیا۔پھرتواس کی زندگی جیسے ویران ہوگئی۔ایک دادی تو تھیں جن سے وہ ہر بات کہتا تھا،جواس کی غم گسار تھیں۔

دادی اس کے ذہن پر پوری طرح چھائی ہوئی تھیں۔ان کی یادیں ہر وقت اسے بے چین رکھتی تھیں۔اکثر وہ تنہائی میں سوچتا رہتا کہ سورج پور میں آخر ایسا کیا ہے؟ جواسے دادی وہاں بھیجنا چاہتی تھی۔اس سے اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملتا،تو وہ مایوس ہوجاتا اورسورج پور بھی نہ جا سکا کہ اچانک بغیر کسی کوشش کے اسے سورج پور جانے کا پروانہ مل گیا،تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، حالانکہ اس کے آفس کے سارےلوگوں نے وہاں جانے سے منع کیا کہ صاحب!اس گاؤں میں نہ جائے۔بڑے بڑے آفیسر وہاں جانے سے گھبراتے ہیں،کوئی آفیسر وہاں ٹک نہیں پاتا لیکن اس کا تو جیسےخواب پورا ہوگیا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں اس نے سورج پور میں جوائین کرلیا۔بہترین بنگلہ اور ساری سہولیتیں

اسے میسر تھیں۔ وہاں کا پٹواری میر مدار جو کہ اس ناول کا خاص کردار ہے، اس کی خدمت پر مامور ہے اور وہ بھی اس کے آتے ہی یہی کہتا ہے کہ آپ فوراً یہاں سے اپنا تبادلہ کہیں دوسری جگہ کرا لیجیے لیکن شہباز یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہے؟ اور ایسے کون سے بھوت ہیں جو اس گاؤں میں مجھے کھا جائیں گے۔ پھر میر مدار بتاتا ہے کہ بھوتوں سے بھی زیادہ خطرناک یہاں رتن پور کے مکھیا اور اس کا بیٹا ہے۔ دونوں نے یہاں کے غریبوں کا جینا محال کر دیا تھا۔ ان کی زمین ہڑپ لی، ندی کا رخ اپنی طرف موڑ کے پانی کے سارے راستے بند کر دئے۔ یہاں کے غریب کسان بھوک اور پیاس سے دم توڑ رہے ہیں۔ جو بھی ان کے مقابلہ میں آتا ہے، وہ اسے قتل کر دیتے ہیں۔ شہباز نے جب یہ حالات سنے تو اس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے گاؤں کے حالات بدلنے کا عہد کر لیا لیکن میر مدار انھیں ہر وقت سمجھاتا رہا کہ وہ یہاں سے چلے جائے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ جب میر مدار نے اسے بتایا کہ اسکی طرح ایک اور جانباز بہادر ایماندار آفیسر یہاں آیا تھا، اس نے بھی بہت کوشش کی تھی لیکن جب اس نے اس آفسر کا نام بتایا تو وہ حیران رہ گیا کیوں کہ وہ کوئی اور نہیں اس کے دادا تھے۔ میر مدار نے بتایا کہ ان کا قتل ہوا تھا اور وہ رتن پور کے مکھیا کی سازش کا شکار ہو گئے تھے، اب اس کی سمجھ میں آیا کہ دادی کیوں سورج پور بھیجنا چاہتی تھیں، یہ حالات سن کر اسے رہ رہ کے دادی کی یاد آتی ہے اور اس کے بعد شہباز نے قسم کھائی کہ وہ دادی کا خواب ضرور پورا کرے گا۔ اپنے دادا کے ادھورے کام کو بھی پورا کرے گا۔ اس طرح اس نے کوشش شروع کر دی میر مدار سے سب حالات سنے۔ میر مدار نے ایک اور دل دہلا دینے والا واقعہ سنایا کہ اس دن خان صاحب کا قتل ہی نہیں ہوا گاؤں کے کئی لوگوں کا قتل ہوا تھا۔ میر مدار کے بیٹے کو زندہ کنوے میں پھینک دیا گیا تھا، اس کی بیٹی اور بیوی کو مار ڈالا

گیا تھا اسے بری طرح زخمی کر دیا گیا۔ یہ سارے واقعات شہباز کے عزائم کو پختہ کرنے کے لئے کافی تھے، رتن پور کے مکھیا اور اس کے بیٹے کے ظلم سے تنگ آ کر بہت سے لوگ جنگلوں میں ایک تنظیم بنا کر انتقام لینے کی فکر میں تھے۔ شہباز نے ان سے مل کر مکھیا سے انتقام کا پلان بنایا اور تجویز یہ رکھی کہ اس سے MLA کی کرسی چھن جائے تو وہ اپنے آپ مر جائے گا۔ اس کے لئے انہوں نے میر مدار کو ایلیکشن میں کھڑا کیا اور سب نے مل کر اسے جتایا اور باغیوں کی تنظیم نے نہ صرف ساتھ دیا بلکہ مکھیا نے جب انتقام کی آگ میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے حملہ کیا تو اس تنظیم کے لوگوں نے نہ صرف گاؤں والوں کی جان بچائی بلکہ مکھیا کا بھی کام تمام کر دیا۔ اس تنظیم میں میر مدار کا کھویا ہوا بیٹا پیش پیش تھا جو اتفاق سے زندہ بچ گیا تھا۔ آخر گاؤں کے مکھیا سے نجات دلا کر ہی دم لیا اور اس ندی کا بہاؤ بھی اپنے گاؤں کی سمت موڑ لیا جس کے پانی کے لئے ان کے ہونٹ نصف صدی سے ایک بوند کے لئے ترس رہے تھے۔ آخر کار وہ ندی ان کے ارمانوں کے بوجھ کو ہلکا کرتی ہے اور انکے کھیتوں کے پھٹے لب بھی پانی سے سیراب ہو جاتے ہیں۔

اس ناول کا پلاٹ بہت ہی عمدہ اور گھٹا ہوا اور مربوط ہے۔ ایک کے بعد دیگرے واقعات آخر تک قاری کے تجسس اور دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں، ان میں باہم ربط معلوم ہوتا ہے۔ اگر چہ ایسا لگتا ہے کہ دادی کے انتقال کے بعد پلاٹ کا بہاؤ تھم جائے گا مگر پھر خواب کے ذریعے اس میں دوبارہ سے وہ بہاؤ نظر آتا ہے اور کہانی اختتام پذیر ہوتی ہے۔ یہی اچھے فن اور فنکار کا شاہکار ہوتا ہے کہ وہ بات میں بات پیدا کر کے کہانی کے تانے بانے کو سلجھاتا ہے۔ الغرض ''آتش دان'' میں قمر جمالی نے پلاٹ کی تنظیم وترتیب میں فنکارانہ صلاحیتوں کا مسلّم ثبوت دیا ہے۔

کردارنگاری:

ناول میں ایک ایسی کہانی کو پیش کیا جاتا ہے جس میں حقیقی زندگی کے مسائل کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ناول نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ ناول میں اپنے تجربات ہی کا بیان کرے اور زندگی کے انھیں افراد کا نقشہ کھینچے جن کی بابت وہ پوری واقفیت رکھتا ہے۔وہ اس بات کی بھی پروانہیں کرتا کہ اس کے قصے کے افراد میں کوئی جان یا سیرت بھی ہے یا نہیں۔اسے تو فقط واقعات کے تسلسل سے کام ہوتا ہے۔مگر ناول نگار اپنے ناول میں زندگی کے حقیقی، گہرے اور پراثر نقش بناتا ہے۔اس لئے اس کو سیرت یا کردارنگاری کی خوبی پر کافی توجہ دینا پڑتا ہے۔ناول کی ادبی اہمیت اس کی کردارنگاری پر منحصر ہے اور وہی ناول زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جہاں جاندار و متحرک کردار ملتے ہیں۔

کردارنگاری کے سلسلے میں پہلی شرط یہ ہے کہ کردار جیتے جاگتے ہوں اور ناول پڑھنے والا ان کو بالکل ویسا ہی محسوس کرے جیسا کہ وہ اپنے گھر والوں کے افراد یا شناسا ہوں یا ان سے ہمدردی یا نفرت ہو یا ناول ختم ہونے کے بعد وہ اس کے تخیل میں باقی رہے۔کسی ناول کے عمدہ کردار کی یاد تادیر قائم رہتی ہے۔

عتیق احمد کردارنگاری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''میں ناول کو انسانی کردار کی مصوری سمجھتا ہوں۔انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔''[1]

---

[1] عتیق احمد، مضامین پریم چند، ص ۲۰۹۔

ناول میں جتنا زیادہ گہرا اور وسیع تجربہ پیش کیا جائے گا اتنا ہی وہ اچھا ہوگا۔ تجربہ کی گہرائی کے سلسلے میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آیا ناول نگار کو اپنے کردار کی چھوٹی چھوٹی ان خصوصیات کو بھی پیش کرنا چاہیے جن سے نہ صرف اس کے طبقہ اور ذات بلکہ گاؤں کا تعلق ہے۔ دادی، شہباز، میر مدار، راجیشور ریڈی، شیونارائین اور خان بہادر یہ سب اس ناول کے اہم کردار ہیں جن کے ارد گرد اس ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے اور ان سب کا آپس میں گہرا تعلق ہیں۔ سب سے بڑا خاصہ ان کرداروں میں یہ ہے کہ یہ حقیقی جیتے جاگتے اور متحرک معلوم ہوتے ہیں۔ اس ناول کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ایک بھی کردار رومانی نہیں ہے۔ ایک کردار بھی نسوانی نہیں ہے، سوائے دادی کے جو بچپن سے ہی ایک فرشتہ کی طرح اعصاب پر سوار رہتی ہے۔ یہ ایک بڑی بات ہے کہ ایک خاتون کے ذریعے لکھا گیا ناول خاتون کردار سے محروم ہے۔ لیکن یہ محرومی اس ناول میں تازگی کا احساس دلاتی ہے اور یہ بھی کہ مزاحمتی اور احتجاجی ناول کے تقاضے عام ناولوں کے مقابلے مختلف ہوا کرتے ہیں۔

شہباز خان ''آتش دان'' کا مرکزی اور اہم کردار ہے۔ وہ ایک جاندار، متحرک اور جیتا جاگتا کردار ہے۔ اس میں زندگی کی حرارت شروع سے آخر تک ملتی ہے، اس میں عزم و ہمت اور برائی کو ختم کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔ اگر اس کردار میں ڈر اور خوف ہوتا اور ظلم کے خلاف لڑنے کا حوصلہ نہ ہوتا تو اس کی دادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو پاتا اور نہ ہی راجیشور ریڈی کی سیاسی چکّی میں صدیوں سے گھسے پٹے عوام کو اپنا حق مل پاتا۔ شہباز خان ہی دادی اور مظلوم عوام کے مابین ایک پل کا کام دیتا ہے اسی کردار کی وجہ سے ناول میں تجسس قائم رہتا ہے۔ اس کے علاوہ شہباز خان ہر آنے والے دور کے نوجوان کے لئے ایک ایسی علامت ہے۔ جو ہوا کے رخ کو موڑنے کا عزم رکھتی ہے اور بڑے سے

بڑے طوفان خیز آندھیوں کو بھی موڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

سورج پور آبی تنازعہ جو برسوں سے پڑا ہوا تھا، اس مسئلہ کو حل کرنے کے کیے شہباز خان نے جی جان سے محنت کی اور آخر کار وہ دن آ گیا جس دن اسے اپنی اس محنت کا پھل بھی حاصل ہوا۔ جو ندی سورج پور کے مظلوم کسانوں کی زمینوں کو کسی زمانے میں سیراب کرتی تھیں، آج شہباز خان کے ذریعے پھر سے اس ندی کا رخ سورج پور کی طرف موڑ دیا گیا اور مظلوم کسانوں کی برسوں کی تمنا پوری ہوگئی۔ اس تناظر میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''آپ نے جو کام کیا ہے جو پچھلے سو برسوں میں کسی نے نہیں کیا۔
اور تو اور ______
سورج پور کی رعایا یہ بھول گئی تھی کہ ندی چھل چھل کرتی بہتی تھی اور اس کے طاس میں سینکڑوں ایکڑ زمین سیراب ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے ریڈی برادران کے ظلم کو حقِ ناشائستہ سمجھ کر تسلیم کر لیا تھا۔
آپ نے تو جادو کر دیا سر ______!''
کہتے ہیں زمین پر جب ظلم کی زیادتی ہو جاتی ہے ___ تب اللہ تعالی کسی مسیحا کو بھیج دیتے ہیں۔
سورج پور کی مظلوم رعایا کے لیے اس نے آپ کو بھیجا ہے۔
آپ واقعی مسیحا ہیں سر ______!'' [1]

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۲۳۲۔

الغرض شہباز خان اس ناول کا وہ متحرک کردار ہے جس کا سوز دروں یا اندر کا آتش دان اس کے ہر مقصد پر غالب ہو جاتا ہے حتیٰ کہ زندگی پر بھی اور تب تک تھمنے کا نام نہیں لیتا ہے جب تک آرزؤں کے سمندر کو عبور نہیں کرتا اور کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ناول سے لیا گیا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''سرکار آپ نے ہمارے لیے وہ کیا ہے جو کسی نے آج تک کرنے کے
بارے میں سوچا تک نہیں۔''
''سرکار کی عمر دراز ہو______ دراز ہو۔
زندہ باد زندہ باد______ شہباز محمد خان زندہ باد''۔
میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں منع کیا۔
''میں نے کوئی جنگ نہیں جیتی ہے۔ یہ کیا کرتے ہو____!''
یہ جنگ ہی تو تھی جو ہم نے آپ کی وجہ سے جیتی ہے، ہم تو یہ بھول گئے
تھے کہ سورج پور میں ایک ندی چھل چھل بہتی تھی۔ ہمیں امید نہیں تھی کہ
کسی دن ہمارا کھویا ہوا حق ہمیں واپس مل جائے گا۔ یہ سب آپ ہی کی
دین ہے سرکار____!''
''زندہ باد____ زندہ باد'' [1]

دادی ''آتش دان'' کا ایک اور اہم کردار دادی کا ہے یہاں بطور علامت استعمال کیا

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۲۳۷۔

گیا ہے۔دادی علامت ہے ماضی کی ، ماضی جوشہباز خان کے جذبہ دروں یا ان کے اندرونی آتش دان کو کبھی بھی ٹھنڈا ہونے نہیں دیتا یہاں تک کہ وہ انقلاب کی منزلوں کو چھو جاتا ہے۔اس کردار میں ہر انسان کے لئے ایک پیام ہے کہ ہر وہ جذبہ ہر وہ چیز جو اپنے ماضی سے متصل رہتا ہے اسے مستقبل کے مراحل اور منزلیں طے کرنے میں دشواری نہیں ہوتی ۔ چونکہ ماضی اس کا سہارا بن کر اسے ان چیزوں کو عبور کرنے میں آسانی فراہم کرتا ہے۔بس جونہی کوئی انسان ماضی کے پنّوں سے کٹ جاتا ہے تو اسے انقلاب کی راہوں کو عبور کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ جو قوم یا گروہ اپنے ماضی سے کٹ کر الگ ہو جاتی ہے اس کی ہستی صفحہ قرطاس سے مٹ جاتی ہے یہی ازل سے وقت کا دستور رہا ہے۔دادی جوشہباز خان کا ماضی ہوتا ہے اسے بحرِ انقلاب کو عبور کرنے میں تساہل عطا کرتی ہے اگر وہ اُس جذبہ ماضی کو فراموش کرتا شاید مزدوروں اور ان تشنہ لب کسانوں کو کبھی بھی اپنا کھویا ہوا حق نہ ملتا۔یہی ماضی شہباز خان کے اندر جذبہ انقلاب کو بھڑکا دیتا ہے اور اسے عزائم کی بھٹی میں کندن بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔انسان میں جب عزائم وحوصلہ بیدار ہو جائے تو یہ ہواؤں کا رخ جس سمت چاہے موڑ سکتا ہے۔عزم وحوصلہ کے بغیر انسان کی مثال خس وخاشاک کی سی ہوتی ہے۔ جو ہواؤں کے زور سے جدھر چاہے بہہ سکتا ہے۔الغرض دادی کا کردار دادی کے انتقال کے بعد بھی ہر جگہ ناول میں بصورت جذبہ وخیال متحرک رہتا ہے۔یہی اس ناول کا شرط اولین ہے جو اس کے انہماک کا سب سے بڑا سبب ہے۔

جوں جوں وقت گزر جاتا ہے تہذیب وتمدن ،طور طریقے ،نقش ونگار اور در ودیوار بھی بدلتے ہیں ۔دادی کا جو کردار مصنفہ نے مذکورہ ناول میں پیش کیا ہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ

دادی محبت ، خدمت ،خلوص کا پیکر تھیں۔دادی کا تخت خالی ہونا ایک بلیغ اشارہ ہے پرانے رسم ورواج،طورطریقے تہذیب وتمدن کا مٹ جانا۔دادی کے کردار کی وضاحت قمر جمالی نے شہباز کے ذریعہ کچھ اس طرح کی ہے:

''دادی کیا تھیں۔!

ایک پوری سلطنت تھیں۔

کسی کی کیا مجال کہ ان کے آگے نظر اٹھا کر بات کرے۔!

کسی کی ہمت کہ انہیں ہاتھ لگائے۔!

یا ضعیف سمجھ کر سہارا دے۔!!

وہ اپنی طاقت آپ تھیں۔

اکثر کہا کرتیں۔

تو میری سلطنت کا ولی عہد ہے۔'' [1]

میر مدار'' آتش دان'' کا متحرک کردار ہے،اگر چہ اس ناول کا مفلس اور لاچار کردار ہے مگر اس میں ہمت ،حوصلہ اور عزائم کی لہریں ہمیشہ مضطرب رہتی ہیں۔میر مدار کا کردار عصر نو کے جابر اور ظالم لوگوں کے لئے ایک انتباہ ہے کہ خاموشی اور بیچارگی کا لاوا جب پھٹنے لگتا ہے تو بڑی سے بڑی سلطنت کی کایا پلٹ سکتی ہے اور جب جوشِ جنوں حد سے تجاوز کر لیتا ہے تو ہوش والوں کی عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔

---

[1] ناول'' آتش دان'' ص ۴۶/۴۷۔

مصنفہ نے میر مدار کے کردار کو ابھارنے میں کمال فن کا مظاہرہ دکھایا ہے۔ایک آفیسر اور ایک نوکر میں کس طرح کا امتیاز ہونا چاہیے وہ مصنفہ نے بخوبی دکھایا ہے۔ یہاں تک کہ میر مدار ایم۔ایل۔اے بن جانے کے باوجود آفیسر شہباز خان کی عزت کیا کرتا تھا۔ذرہ برابر بھی اسے اپنے اعلیٰ عہدے کا غرور نہیں تھا۔میر مدار اپنے آفیسر کے تئیں وفادار،فکرمند،احسان مند تھا اور وہ جانتا تھا کہ آج وہ کچھ بھی ہے وہ شہباز کی بدولت ہی ہے ناول میں ایک جگہ جب وہ ایم۔ایل۔اے بننے کے بعد شہباز سے ملتا ہے تو اپنے جذبات کو یوں بیان کرتا ہے:

''سب آپ ہی سے سیکھا ہے۔حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔میں جو بھی ہوں ،جیسا بھی ہوں سب آپ کے قدموں کی دھول ہوں۔۔۔۔

جوں ہی میر مدار اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف جھکا میں نے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

ہوش میں رہو میر مدار۔۔۔۔۔۔!

اس وقت تم ایم۔ایل۔اے ہو۔'' [1]

راجیشور ریڈی مذکورہ ناول کا وہ کردار ہے جو آئے دن اپنے ذاتی اغراض و مفادات کے لئے سیاسی سفا کی اختیار کر کے لوگوں کا نہ صرف استحصال کرتے ہیں بلکہ ان کا اپنے حقوق طلب کرنے پر

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۱۹۷۔

قتل بھی کرتے ہیں۔ مکاری، دغا بازی، خون خرابہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔آج کے دور میں ایسے حقیقی کردار سیاسی درباروں میں بے شمار رقصاں ملیں گے جو اپنے ذاتی مفاد کے لئے انسانیت کی بیٹھ پر چھری چلاتے ہیں اور انسانیت کا ناحق خون بہا کر اپنی عنادیت کی پیاس بجھاتے ہیں۔ اس کی سیاسی چال بازی و چالاکی کی ایک مثال دیکھئے:

''سورج پور کا آبی تنازعہ ایک نہ ختم ہوتے والا معاملہ ہے۔ دراصل یہ مسئلہ ہندوستان کے مسئلہ کشمیر جیسا رخ لے چکا ہے۔ اسی کے نام سے یہاں کی سیاست زندہ ہے۔ اسی کے بل بوتے پر شیونارائن ریڈی نے پارلیمنٹ میں سیٹ حاصل کی تھی اور اب راجیشور ریڈی اس کی تقلید کر رہا ہے۔ مکاری، دغا بازی، خون خرابہ ______ یہ سب راجیشور ریڈی کو وراثت میں ملا ہے۔ آپ اس سے نہیں جیت سکتے۔'' [۱]

SVF کے نوجوان اور دیگر مظلوم افراد اشترا کی تہذیب کے نمایاں کردار اس ناول میں پیش کئے گئے ہیں جو ظلم کی چکی میں پس کر فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں اور ظلم کے خلاف سر بہ کف قائم ہو جاتے ہیں۔ اس تنظیم میں میر مدار کا بیٹا بھی شامل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر افراد جو اس تنظیم میں تھے وہ ظلم و جبر کو ختم کرنے کی ٹھان لیتے ہیں اور وہ اپنے اس منصوبے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

SVF کے جوانوں میں انسانیت، ہمدردی، دوستی سب کچھ موجود ہے۔ وہ صرف اور صرف

---

[۱] ناول ''آتش دان'' ص ۹۷۔

ان لوگوں کے لیے خطرہ ہے جو غریبوں پر استحصال اور طرح طرح کے ظلم وستم کرتے ہیں۔ SVF کے کمانڈر اور شہباز خان کے درمیان جو بات چیت ہوتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی سے کوئی دشمنی مول نہیں لیتے جب تک کوئی مجبور نہ کریں۔مثال کے طور پر:

''انسان طاقت کے بل بوتے پر نہیں ہمت کے بل بوتے پر بہادر کہلاتا ہے۔آفیسر____! ڈرو نہیں۔ہم دوست ہیں اور جب تک کوئی مجبور نہیں کرتا SVF خون خرابہ نہیں کرتا۔یہ ہمارا MOTTO ہے۔''[1]

SVF کے کرداروں میں میر مدار کا بیٹا بھی ایک عمدہ کردار بن سکتا تھا مگر مصنفہ نے زیادہ تر اس کی طرف توجہ نہ دے کر اس کردار کو ضمنی بنا دیا۔جس میں زندگی جینے کا حوصلہ ہے، وہ پرعزم نوجوان ہے جو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔مثال دیکھئے:

''مجھے غور سے دیکھو____ آفیسر____! میں میر مدار کا بیٹا ہوں۔ ان درندوں نے میرے باپ کو میرے سامنے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ میری بہن کی ناموس لوٹی اور گلا دبوچ کر مار ڈالا۔ میرے باپ کی دھندلاتی آنکھوں کے سامنے مجھے اٹھا کر کنویں میں پھینک دیا۔گاؤں کے کچھ سرفروشوں نے مجھے کنویں سے نکالا____ وہ منظر آج بھی یاد ہے مجھے۔ میں اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا۔ ہر طرف آہ و بکا تھی۔زمین خون سے سرخ تھی۔گاؤں کے سارے نوجوان زخمی تھے______ ہم سب

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص،۱۴۱۔

نوجوانوں نے جوشیونارائن ریڈی کے ظلم کا شکار ہوئے تھے،مل کر ایک تنظیم بنائی۔SVF یعنی سورج پور والینٹرز فورس اور قسم کھائی تھی کہ بنی نوع انسان کا خون بہائے بغیر راجیشور ریڈی والد شیونارائن ریڈی کو شکست دیں گے اور اپنے بزرگوں کی آنکھیں بند ہونے سے قبل اس آبی ذخیرے کو واپس سورج پور لے آئیں گے۔'' ؎۱

مولوی رحمت اللہ نے مذکورہ ناول میں ایک چھوٹا ہی سہی مگر پر اثر رول ادا کیا ہے۔وہ گھوڑوں کے بیوپاری کی حیثیت سے ناول میں وارد ہوتا ہے۔ان کا کردار مصنفہ نے بالکل ویسے ہی اجاگر کیا ہے جیسے وہ ہونا چاہیے تھا۔ان کے حلیے سے ہی یہ معلوم پڑتا ہے کہ وہ بڑے بہادر قسم کے آدمی تھے۔لوگ ان کے قریب جانے سے ڈرتے تھے۔مولوی رحمت اللہ کی کردار نگاری کے سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''کون مولوی رحمت اللہ۔۔۔۔

گھوڑوں کے بیوپاری تھے۔

بڑا دبدبہ تھا ان کا۔بڑے عجیب آدمی تھے۔سچ پوچھو تو وہ اس زمین سے اٹھے بھی نہیں تھے۔جانے کہاں سے آکر بس گئے تھے ان کے باپ دادا یہاں خاندانی رئیس تھے اور عربی النسل کے گھوڑوں کی پرورش کرتے تھے انہیں یہ سدھاتے تھے۔

؎۱ ناول ''آتش دان'' ص،۱۳۴۔

پٹھانی شلوار قمیص اور سر پر کلف لگی پگڑی باندھ کر جب وہ گھوڑے پر سوار نکلتے تو گاؤں میں چلتے لوگ آپ ہی آپ رستہ چھوڑ دیتے تھے۔گھوڑوں کے ٹاپوں کے ساتھ ساتھ ان کے سر پر بندھی پگڑی کا پھندنا اوپر نیچے ہلتا تو لگتا کوئی فوجی کرنل لفٹ رائٹ کرر ہا ہے لوگ ان کے قریب جانے سے ڈرتے تھے۔حتیٰ کہ شیونارائن بھی۔'' [۱]

اس ناول میں درویش محمد خان کا کردار ان حق گو اور بیباک لوگوں کا آئینہ دار ہے جو حق کو اپنی ذات پر فوقیت دیتے ہیں اور اس کی خاطر اپنی جان نچھاور کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔درویش محمد خان کا کردار ناول میں قمر جمالی نے کچھ اس طرح اجاگر کیا ہے۔جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے پوتے کی طرح مظلوموں اور غریبوں کی حمایت میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتے تھے۔درویش محمد خان کے کردار کی وضاحت میر مدار اور شہباز خان کی گفتگو سے کچھ اس طرح ہوتی ہے:

''وہ آپ ہی کی طرح ضدی اور گرم خون کے مالک تھے۔مگر بے حد ایمان دار، نفیس اور بہت اچھے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔غریبوں کے لیے ان کے دل میں اتنا درد تھا کہ جب تک رہے کبھی پیٹ بھر کھانا بھی نہیں کھایا۔'' [۲]

---

[۱] ناول ''آتش دان'' ص۹۰۔

[۲] ایضاً، ص۸۸۔

دوویش محمد خان کے کردار کے بارے میں ان کی اہلیہ یعنی دادی اپنے پوتے شہباز خان کو کچھ اس طرح بتاتی ہے جس سے اس بات کی بخوبی واقفیت ہوتی ہے کہ درویش محمد خان ایک نہایت ہی نیک ، ایماندار اور حق گو انسان تھے۔مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

'' تیرے دادا ایک نہایت ہی ایماندار افسر تھے۔عوام میں بڑے ہر دلعزیز تھے۔ان کے سکھ دکھ کے ساتھی، مسکینوں اور مظلوموں کے مسیحا۔ یوں کسی حاجت مند نے دستِ حاجت دراز کیا کہ انہوں نے روا کی۔ انہوں نے دوسروں کی ضرورت کو ہمیشہ اپنی ضرورتوں پر ترجیح دی۔ نہایت رفیق القلب تھے۔دوسروں کے درد پر ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔'' [۱]

مجموعی اعتبار سے کردار نگاری میں قمر جمالی کے قلم نے کمال دکھایا ہے۔شہباز خان کے علاوہ ناول میں کئی اور کردار ہیں۔کچھ دور تک پھیلے ہوئے ، کچھ پل بھر کو نظر آ کر آنکھ سے اوجھل ہو جانے والے مگر وہ کردار لازوال اور حافظے سے کبھی نہ مٹنے والے ہیں مثلاً دادی، میر مدار، مولوی رحمت اللہ، درویش محمد خان، شیونارائن ریڈی، SVF کے نوجوان، راجیشور ریڈی وغیرہ۔کسی ناول میں کوئی کردار ایک دم سے ہمارے سامنے نہیں آ جاتا بلکہ رفتہ رفتہ ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔اچھے کردار وہی ہوتے ہیں جن کے بارے میں ناول کے ختم ہونے تک ہم کچھ نہ کچھ نئی بات معلوم کرتے

---

[۱] ناول '' آتش دان'' ص ۴۲۔

رہیں۔’’آتش دان‘‘ کا یہی وصف ہے کہ اس میں جو گہرا تجسس نمایاں طور پر ملتا ہے وہ سب اس کے کرداروں کی بدولت ہے۔ ہر کوئی کرادار اپنے آنے والے کے لئے ایک معمہ حل کرنے کے لئے چھوڑتا ہے اور جس کی گتھیاں سلجھانے کے لئے وہ کردار متحرک ہو جاتے ہیں۔ الغرض کردار نگاری کے فن پر قمر جمالی نے خاصی توجہ دی ہے اور کرداروں کی زبان سے نکلے ہوئے مکالمے اس طرح استعمال کیے گیے ہیں جس سے ناول کا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

مکالمہ نگاری:

مکالمہ بھی ناول کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کے ذریعے کرداروں کی خصوصیات نہایت دلچسپ طریقے سے ظاہر کی جاسکتی ہیں۔ بات چیت انسانی زندگی کا سب سے اہم پہلو پیش کرتی ہے اور اسی کے ذریعے سے ہمیں کرداروں کے شخصیت اور ان کی تمام خصوصیات سے آگہی ہوتی ہے۔ کسی شخص سے ہماری واقفیت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک ہم اس سے بات چیت نہ کرلیں۔

اچھے مکالمہ لکھنا بھی ایک فن ہے اور اس فن کے تئیں قمر جمالی نے اچھی طرح انصاف کیا ہے۔ مکالمہ لکھتے وقت ناول نگار پورے طور پر ڈرامہ نگاری کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اچھا مکالمہ قصہ کو ایک روشنی بخشتا ہے اور ڈرامائی قوت کو ظاہر کرتا ہے۔ قصہ کے ارتقا میں مکالمہ کا بہت کافی حصہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے واقعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مکالموں میں ناول نگار کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ہر کردار اپنے طبقہ اور حیثیت کے مطابق گفتگو کرے۔ ایک آفیسر اور ایک ادنیٰ ملازم کی گفتگو میں جو فرق ہوگا اس کو ملحوظ رکھنا

ناول نگار کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ایک شہنشاہ اور ایک غلام،ایک ملکہ اور ایک لونڈی کے مکالموں ہی سے ان کی سماجی حیثیت اور مقام و مرتبہ ظاہر ہوتا ہے۔ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''اگر مکالمے دلچسپ،موزوں اور برمحل ہوتے ہیں تو پڑھنے والے کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔مکالمے کے ذریعے ہم کرداروں کو پہچانتے ہیں اور اس کی روح تک پہنچتے ہیں۔مکالمے کرداروں کے جذبات، خیالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔''[1]

قمر جمالی نے مکالمہ نگاری میں بھی اپنی فن کاری کا اچھا مظاہرہ کیا ہے اور ہر کردار کی زبان سے ایسے مکالمے ادا کروائے ہیں جو بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ہم قدم قدم پر اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ اس موقعے پر اس کردار کے منھ سے یہی الفاظ ہونے چاہیے تھے۔مکالمے کرداروں کے باطن کو بے نقاب کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

''آتش دان'' کی شروعات دادی اور شہباز کے مکالمہ سے ہوتی ہے۔اگر چہ یہ مکالمے کہانی کی صورت میں شروع ہوتے ہیں۔دادی کے مکالمے وہی پرانے زمانے کی کہانیوں کی طرح شروع ہوتے ہیں اور دادی کا یہی کام ہوتا تھا کہ وہ بچوں کو سونے سے پہلے کہانی سنائے بالکل ''آتش دان'' کی دادی کی طرح جو شہباز کو سلانے کے لئے ہر روز کہانیاں سناتی ہیں۔دادی سے مکمل کہانی سننے کے لیے جس طرح بچے ضد کرتے ہیں شہباز اور دادی کے مکالمے سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

---

[1] سلام سندیلوی،ادب کا تنقیدی مطالعہ،۱۹۶۰ء،ص ۱۶۶۔

دادی اور پوتے کے درمیان کی مکالمہ نگاری ملاحظہ کیجیے:

''پھر.......

بوڑھے بابا نے اشرفیوں کا ایک توڑا اس لڑکے کے ہاتھوں میں تھما دیا اور کہا۔

''لڑکے ______ !اصطبل سے جو گھوڑا چاہو نکال لو'

اور........

''سرپٹ دوڑ نکلو یہاں سے۔''

دادی نے سروتا پاندان کی کشتی پر رکھتے ہوئے کہا اور اٹھنے لگیں۔

''مگر دادی ______ !یہ تو بتاتی جاؤ کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا ______ ؟

دادی نے رک کر ایک نظر میری طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے شب بخیر کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔'' [1]

شہباز کا تجسس یہی ہوتا ہے کہ دادی نے جو کہانی ادھوری چھوڑی اسے پھر سے سنے، دوسرے دن دادی پھر سے کہانی سناتی ہے اور شہباز کا تجسس اسی طرح کہانی سننے کو برقرار رہتا ہے۔

دادی اور پوتے کے درمیان مکالمہ ملاحظہ ہو:

''اچھا ___ تو بتا کہاں تھی میں ______ ؟''

دادی نے پلنگ کے سرہانے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا تو میری جان میں جان آئی۔

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۱۱۔

''وہ____وہ دادی____ ''میں سوچ میں پڑ گیا۔

''پھر...... بوڑھے بابا نے اشرفیوں کا ایک توڑا لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا۔

''ہاں یاد آیا____''

''پھر...... بوڑھے بابا نے اشرفیوں کا ایک توڑا لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا......

''لڑکے____! اصطبل سے جو گھوڑا چاہو نکال لو اور سرپٹ دور نکلو یہاں سے۔'' [1]

مکالمہ نگاری کے لیے بھی کہا جاتا ہے کہ ناول نگار بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہو۔ دادی اور پوتے کے درمیان کی اس مکالمہ نگاری سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قمر جمالی کو بچوں کی نفسیات سے پوری واقفیت حاصل ہے۔ انھوں نے شہباز اور دادی کے مکالموں کے ذریعہ ان کے خیالات اور جذبات کی اچھی ترجمانی کی ہے، شہباز کے کردار کے ذریعہ انھوں نے بچوں کی نفسیات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کبھی کبھی جب میرا دل اسکول جانے سے اچٹ جاتا اور میرے پیٹ میں، سر میں یا ٹانگ میں جانے کہاں کہاں درد اٹھتا کہ میں سرتاپا درد بن جاتا اور مجھے اسکول جانے سے چھٹی مل جاتی______

ممی ڈیڈی کے آفس چلے جانے کے بعد ہا، ہو، کرتا ہوا دادی کے کمرے میں داخل ہوتا تو دادی کسی نٹ کھٹ بچّے کی طرح ہنس رہی ہوتیں۔

''کیوں بیٹا______! بنا لیا الّو''_______!

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۱۷۔

''نہیں دادی ______ تمہاری قسم ______''

''ہاں بیٹا! کھائے جا جھوٹی قسمیں۔کیا حرج ہے''

''نہیں دادی ______ ایسا نہ کہنا ______''

میں لپک کر انکی گردن سے جھول جاتا اور پٹاپٹ بوسے لینے لگتا۔

''دادی ______! پھر کبھی مرنے کی بات نہ کرنا۔اور اگر ______ تمہیں مرنا ہی ہوا ______ تو مجھے بھی ساتھ لیکر مرنا۔میں تمہارے بغیر جی نہ پاؤں گا۔'' [1]

دادی اور پوتے کے درمیان اس مکالمہ سے ان کے درمیانی رشتے اور جذباتی لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔

سورج پور کے لوگ کس طرح ظلم و جبر میں پس رہے ہیں، کیسے راجیشور ریڈی نے اپنے منصب کا رعب جماتے ہوئے ان مظلوم کسانوں کو ندی کے پانی سے محروم کیا۔میر مدار اور شہباز خان کے درمیان مکالموں سے ان خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔مثال کے طور پر:

سرکار۔!ندی دونوں کناروں تک پانی سے لبریز رہا کرتی تھی اور کنارے کھڑے ناریل کے درخت اپنے قد سے اونچے سائے ندی کی چھل چھل کرتی لہروں پر دور گاؤں تک بھیجا کرتے جیسے کوئی ہجرت کا مارا

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص،۲۴/۲۵۔

دور دراز مقامات میں اپنے ہم وطنوں کو اپنے ہونے کی اطلاع بھیجتا
ہے۔'' مگر فی الحال جائے وقوع پر ایسا کچھ نہیں تھا۔ درختوں سے شادابی
لٹ چکی تھی________ ندی کا یہ اتھل پن قدرتی نہیں ہے۔ ترائی
میں رتن پور گاؤں آباد ہے۔ اس گاؤں کا مکھیا ایک سفاک اور نہایت ہی
ظالم آدمی ہے۔ برسات کا پانی بظاہر باڑ سے بہتا محسوس ہوتا ہے مگر نیچے
پہنچ کر ایک ایسے آبی ذخیرے میں جمع ہو جاتا ہے جسے رتن پور کے مکھیا
نے بند باندھ کر اپنے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔'' [1]

منظر نگاری:

منظر نگاری یا منظر کشی بھی ناول کا ایک اہم جز ہے لیکن بعض ناقدین منظر نگاری کو ناول کا لازمی جز نہیں مانتے، پھر بھی ناول میں قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے منظر کشی ضروری ہے، منظر نگاری میں ناول نگار کو زندگی سے تعلق رکھنے والے ساز و سامان کا ذکر اس طرح سے کرنا چاہیئے کہ اسکی تصویر نظروں میں گھوم جائے۔ ناول نگار کی کوشش یہی رہتی ہے کہ وہ زندگی کے مختلف حالات و کیفیات جیسے خوشی اور غم کی ترجمانی بھی ایسے مناظر سے کرتا ہے، اس سے کرداروں کے جذبات و خیالات کی حقیقی عکاسی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قدرتی مناظر موسموں، بازاروں، میلوں، ٹھیلوں وغیرہ کے مناظر بھی ناول میں پیش کیے جاتے ہیں۔

علی عباس حسینی منظر نگاری کے متعلق اپنی آرا کا اظہار خیال کچھ اس طرح کرتے ہیں:

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۶۴۔

''منظر نگاری کی وجہ سے زمان ومکان کی تعین ہوتی ہے۔اوقات اور موسموں کا بیان ،کمروں اور مکانوں کے خاکے ،آبادیوں کے نقشے ،اسباب ضرورت و زینت کی تصویریں اور ناچ رنگ ،میلوں ٹھیلوں،جلسوں جلوسوں کے معرکے اسی جز سے متعلق ہیں۔ناول نگار کو چاہیے کہ وہ ان امور کو اس سلیقے اور اس انداز سے بیان کرے کہ پڑھنے والے کے سامنے بالکل تصویر کھنچ جائے۔شاعری میں اسی کو محاکات کہتے ہیں۔''[1]

منظر نگاری کے لحاظ سے جب ہم ناول ''آتش دان'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ قمر جمالی نے منظر نگاری کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔انھوں نے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو قصے سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔موسم سرما کی منظر کشی قمر جمالی نے اس ناول میں کچھ اس کی ہے:

''دسمبر کی ٹھٹھرا دینے والی سردی تھی۔ٹھنڈ ہڈیوں میں پیوست ہونے لگی تھی۔دادی کے حکم پر میں بستر پر لیٹ تو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ایک اضطراب تھا۔

بے چینی تھی انجانی سی جو مجھے بستر پر لیٹنے سے روک رہی تھی۔میں دادی

---

[1] علی عباس حسینی،اردو ناول کی تاریخ اور تنقید،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۲۰۱۱ء،ص ٦٦۔

کے پیچھے باہر جانا چاہتا تھا مگر سردی تھی کہ برف کی سل لیے دروازے پر کھڑی تھی۔سچ تو یہ ہے کہ میں دو قدم دروازے کی طرف بڑھا بھی۔۔۔۔۔۔پھر لوٹ آیا۔

اف رے سردی۔۔۔۔!!

میرے دانت کٹکٹانے لگے تھے۔'' [1]

سونا گاؤں کی منظر کشی قمر جمالی نے اس عمدگی سے کی ہے کہ یوں لگتا ہے کہ ہم خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ایک مثال ملاحظہ ہو:

''سونا گاؤں:

سنا تھا کہ یہاں کا موسم بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔

خود دیکھ بھی لیا۔

حد نظر تک ہریالی سے گھرا ہوا علاقہ بے حد خوبصورت تھا۔وہاں اکثر وبیش تر بارش ہوتی رہتی تھی اونچے اونچے درختوں کی بہتات سے اکثر اندھیرا چھایا رہتا۔لگتا تھا کہ مٹی کے ٹیلوں کو کاٹ کر سڑکیں بنائی گئی تھیں۔اس لیے ان سڑکوں پر سے گزرو تو وادیوں سے گزرنے کا احساس ہوتا تھا۔قدرت نے اس پورے علاقے کو اپنے دست خاص

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۱۱۔

سے سنوارا تھا۔'' [1]

نہ صرف موسموں، گاؤں اور دیہات کا منظر اس ناول میں ملتا ہے بلکہ ندی کی بھی منظر کشی بڑے سلیقے سے کی گئی ہے جس سے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

''ندی میں پانی برائے نام تھا۔
کسی زمانے میں ندی کا پانی کافی کشادہ رہا ہوگا مگر۔
مگر اب۔۔۔۔۔۔۔سوکھ کر سمٹ گیا تھا۔
صاب۔! ایک زمانہ تھا جب اس ندی کے دونوں کناروں پر تاڑی اور ناریل کے آسمان سے باتیں کرتے درخت کھڑے ہوئے تھے۔ ندی کے پیچھے میں لوگ آبی کاشت کرتے تھے۔۔۔۔
یہ میراپی اے تھا جو مجھے ندی کے متعلق معلومات فراہم کر رہا تھا
سرکار۔! ندی دونوں کناروں تک پانی سے لبریز رہا کرتی تھی اور کنارے کھڑے ناریل کے درخت اپنے قد سے اونچے سائے ندی کی چھل چھل کرتی لہروں پر دور گاؤں تک بھیجا کرتے جیسے کوئی ہجرت کا مارا دور دراز مقامات میں اپنے ہم وطنوں کو اپنے ہونے کی اطلاع بھیجتا ہے۔'' [2]

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص۵۴۔

[2] ایضاً، ص۶۱۔

شام کے منظر کو بہت ہی خوبصورت انداز میں قمر جمالی نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔ اقتباس پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہم اس جگہ موجود ہے اور اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔مثال دیکھیے:

''جب میں ایوننگ واک کے لیے باہر نکلا تو سورج پوری آب وتاب
کے ساتھ چمک رہا تھا۔
مگر اب ____
سورج چمک چمک کر تھک گیا تھا۔
درختوں پر سنہری کرنیں پرندوں کو اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹنے کا
اشارہ کررہی تھیں۔
سر پر رنگ برنگے پرندے نہایت تندہی سے پَر مار رہے تھے۔انہیں
اندھیرے گہرے ہونے سے پہلے اپنی ٹھکانوں تک پہنچ جانا تھا۔
شاید انہیں بھی اندھیروں میں گھل مل جانے کا خوف تھا۔'' [1]

آبی تنازعہ جب حل ہوتا ہے تو ندی کا رخ موڑنے کے لیے سورج پور کے لوگ بے تاب تھے۔وہ صبح سویرے گھروں سے نکل کر ندی کے تٹ پر جمع ہونے لگے تاکہ ندی کے رخ کو اپنے گاؤں کی طرف موڑ کر ان کو اپنا کھویا ہوا حق واپس حاصل ہو جائے۔قمر جمالی نے بڑی عمدگی کے ساتھ اس منظر کو قلم کے قالب میں ڈھالا ہے۔مثلاً:

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۱۲۵

''صبح چار بجے سے ہی لوگ ندی کے تٹ پر جمع ہونے لگے تھے۔اچھا
خاصہ مجمع لگ گیا تھا۔
بس انتظار تھا____
تو میرا۔
میر مدار پہلے ہی موقع پر موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف دوڑ پڑا۔
''سرکار____! زمین پر پہلا سبل آپ ماریں گے_____''
ابھی میر مدار کا جملہ مکمل ہوا بھی نہ تھا کہ گاؤں والوں کا ایک ہجوم نعرے
لگاتا ہوا گاؤں کی سمت سے نمودار ہوا۔
ایک بحر بیکراں تھا۔
سفید، کالے، بھورے سروں کا
کیا بچے، کیا بوڑھے، ہر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق ہاتھوں میں سبل
پھاوڑے اور ٹوکرے لئے منتظر تھا۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے آتا دیکھا۔
انسانوں کے اس تھمتے ہوئے سمندر میں سیل رواں کی کیفیت پیدا
ہوئی۔'' [1]

الغرض مندرجہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قمر جمالی کو کسی واقعے کی سچی تصویر کشی کرنی کتنی عمدگی سے آتی ہے۔وہ جس واقعہ اور منظر کی تصویر کھینچتی ہیں وہ واقعہ اور منظر ہماری

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۲۲۵۔

آنکھوں میں رقص کرنے لگتا ہے۔اس ناول میں انھوں نے ایسے بہت سے نمونے پیش کیے ہیں جن کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے مصوری اور آرٹ میں بھی قمر جمالی کو بڑی مہارت حاصل ہے جس کا مسلم ثبوت انھوں نے اس ناول کو پیش کرنے میں دیا ہے۔

جزئیات نگاری:

کہانی میں چھوٹے چھوٹے امور کی ضرورت کے مطابق تفصیل بیان کرنا جزئیات نگاری کہلاتا ہے۔جزئیات کے لئے پلاٹ اور قصے کا لحاظ لازمی ہے ورنہ جزئیات پلاٹ میں پیوند کاری کی حیثیت اختیار کرلیں گے۔ناول میں جزئیات کا شمار درحقیقت مینا کاری کا درجہ رکھتا ہے۔حساس ناول نگار کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جزئیات کا استعمال کس حد تک ہونا چاہیے۔جس طرح ایک مصور تصویر بناتے وقت رنگ،اس کی مقدار اوراس کے مناسب استعمال سے تصویر میں خوبصورتی پیدا کرتا ہے اسی طرح ناول نگار جزئیات سے ناول کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔اگر مصور کے قلم میں رنگ زیادہ ہو جائے تو تصویر بدرنگ ہو جاتی ہے اسی طرح جزئیات کو پلاٹ میں بے جا داخل کرنے سے ناول کے حسن میں فرق آجاتا ہے۔قمر جمالی نے جزئیات نگاری کے بہترین نمونے ناول ’’آتش دان‘‘ میں پیش کئے ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ ہو:

> ’’پو پھٹنے سے پہلے ہی لوگ اپنی اپنی حاجتیں سنانے ڈاک بنگلے کے صحن میں جمع ہونے لگے تھے۔میں ابھی ابھی صبح کی عبادت سے فارغ ہو کر باہر نکلا تھا۔محکمہ والوں نے میری چائے کا انتظام باہر ورانڈے میں کر رکھا تھا۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔سامنے نہر میں مرغابی

کے جوڑے پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے اور سورج کی شنگرفی کرنیں
پھیل سکڑ کر عجیب رنگ برنگی دائرے بنا رہی تھیں۔ جب بھی کوئی مرغابی
ڈبکی لگا کر سر اوپر اٹھاتی، قوس وقزح کا ایک دائرہ اپنے اطراف کس لیتی
تھی۔ ماحول اس قدر روح پرور تھا کہ اس کی تعریف کرنا کفرانِ نعمت
تھا۔'' [1]

اور پھر یہ مثال دیکھئے جس میں کاوالکاروں اور نیرڑھیوں کی غربت کی تصویر کشی ان کے حلیہ کے ذریعہ یوں کی گئی ہے:

'' کالے کالے، دبلے پتلے کاوالکار، دھوتی اور نیم آستین، سر پر سر سے
بڑی پگڑی اور ہاتھ میں قد سے اونچی بانس جس کے اوپری سرے پر
لوہے کی کیل۔ گلے میں ڈوری سے لٹکا ایک شناخت نامہ پتیل کا بلّہ خشکی
پر کاوالکاروں کی اور آبی ذخیروں پر نیرڑھی۔'' [2]

ان اقتباسات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو جزئیات نگاری اور حلیہ نگاری پر قدرت حاصل ہے۔

جذبات نگاری:

ناول میں جو کہانی یا کردار پیش کیا جاتا ہے اس کا تعلق ہمارے جذبات سے بھی ہوتا ہے۔

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص۵۶۔

[2] ناول ''آتش دان'' ص۶۶۔

کیونکہ ناول کی دنیا جذبات سے بھری ہوتی ہے۔ کہانی کبھی پوری حزینہ ہوتی ہے تو کبھی پوری نشاط انگیز یا کبھی کچھ حصہ حزینہ ہوتا ہے اور کچھ نشاط انگیز۔ ناول نگار تقریباً ہر قسم کے جذبات اپنی کہانی میں پیش کرتا ہے۔ ناول میں جو جذبات ہوتے ہیں اس میں حسن وعشق کا تصادم، محبت کی فراوانی، اس کے علاوہ مذہبی لگاؤ تاہم اس جذبے کی موافقت اور مخالفت میں کئی اور جذبے ملتے ہیں۔ جذبات نگاری کے تعلق سے ڈاکٹر مجید بیدار لکھتے ہیں؛

> ''ناول کے پلاٹ کی تشکیل کے موقع پر جذبات کو بھی خصوصی اہمیت
> حاصل ہے اور جس کے بغیر ناول میں تحریک پیدا نہیں ہوتی، اس لئے
> ناول نگار کو جذبات کا سہارا لینا ضروری ہے۔'' [۱]

ناول میں جذبات کا اظہار پورے لوازمات کے ساتھ ضروری ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ کرداروں کے احساسات کا پتہ چلتا ہے۔ غصہ، ناراضگی، بے رحمی، چاہت، مخالفت اور نہ جانے کتنے ایسے جذبات ہیں جن کو موقع ومحل کی مناسبت سے ناول میں مصنف پیش کرتا ہے اور یہ عمل ناول نگاری کی فنی دلچسپی سے متعلق بھی ہوتا ہے۔ ناول نگار میں جس قدر لطیف جذبوں اور جمالیاتی حسن کو محسوس کرنے کی صلاحیت ہوگی اتنی ہی کامیابی کے ساتھ جذبات نگاری کے عمدہ نمونے وہ پیش کرسکتا ہے جس کی وجہ سے قاری کے دل پر ایک گہرا تاثر پڑتا ہے۔ قمر جمالی نے ''آتش دان'' میں جذبات نگاری

---

[۱] ڈاکٹر مجید بیدار، ناول متعلقات ناول، نیشنل فائن پرنٹنگ پرس حیدرآباد، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۱۔

کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں مثال کے طور پر:

''میر مدار_____! میں نے محسوس کیا کہ تم درویش محمد خان کی ٹریجڈی سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو۔اس کی کوئی خاص_____؟''
چائے کا گھونٹ اس کے حلق میں اٹک گیا۔حلق بند ہو گیا اور آنکھیں پھیل گئیں میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور اسے اس کیفیت سے باہر لے آیا۔ وہ بے حد پریشان دکھائی دینے لگا اور ٹھہری ہوئی آنکھوں سے راست میری آنکھوں میں دیکھنے لگا گویا کہ میری آنکھوں میں کوئی بھیانک منظر دیکھ رہا تھا۔'' [1]

مذکورہ بالہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر مدار کو درویش محمد خان سے کافی انس تھا۔درویش محمد خان کے قتل کا دکھ میر مدار نے اپنے سینے میں چھپا کے رکھا تھا جو شہباز محمد خان کے پوچھے جانے پر ان کے اندر کے جذبات بے ساختہ بہہ نکلتے ہیں۔خان بہادر کے قتل کے بعد شیو نارائن نے ان لوگوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا جو لوگ خان بہادر کے رفیق تھے۔ان پر طرح طرح کے ظلم وستم کیے، مردوں اور بچوں کو قتل کیا گیا،عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں،کسانون کی زمینیں چھینی گئیں۔مثال دیکھئے:

''خان بہادر کی موت کے بعد شیو نارائن ریڈی کا قہر خان بہادر کے ہمدردوں پر ٹوٹا۔سب سے پہلے اس نے میرے خاندان پر حملہ کیا۔ میری بیوی کو مار ڈالا۔میری بیٹی کی میری آنکھوں کے سامنے____

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص۱۴۵۔

ہائے______ہائے________''

وہ زور زور سے اپنا سینہ پیٹنے لگا۔'' [1]

قمر جمالی کے ناول سے ان مثالوں کے مطالعے کے بعد ہی نداز ہ ہوتا ہے کہ انھیں جذبات نگاری پر بھر پور قدرت حاصل تھی۔ وہ اپنے کرداروں کی شخصیت، ان کی نفسیاتی کیفیات اور ان کے جذبات و احساسات کا بھر پور ادراک رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے کرداروں کے جذبات کی عکاسی بڑی عمدگی سے کی ہے۔

اسلوب زبان:

کسی بھی ناول کے معیار کو جانچنے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے اس ناول کے قصے، کردار، فضا، ماحول اور اس میں پیش کیے گئے مواد کے علاوہ ناقدین فن اس کے اسلوب اور زبان کے محاسن و معائب کا بھی جائزہ لیتے ہیں کیوں کہ فن ناول نگاری میں اسلوب و زبان کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اطہر پرویز اپنی کتاب ادب کا مطالعہ میں لکھتے ہیں:

''جس طرح بت تراش مجسمہ بنانے کے بعد اس کے جذبات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کی نوک پلک درست کرتا ہے اسی طرح ایک بڑا ناول نگار اپنے ناول کے مواد کو مرتب کرنے کے بعد اسکے فنی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ ناول کو ہر زاویے سے دیکھتا ہے اور اس میں تناسب پیدا کرتا ہے یہ دیکھتا ہے کہ زبان صحیح ہے اور پورے طور پر

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۱۴۸۔

موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ناول نگاری تخلیقی فن ہے۔اس کے لیے بھی اسی فنی اہتمام کی ضرورت ہے جس کی شاعری میں توقع کی جاتی ہے۔ یہاں بھی الفاظ کی جادوگری اپنا کام کرتی ہے۔ یہاں تک کہ محاورات بھی اسی اہتمام سے استعمال ہوتے ہیں، بات کتنی ہی اچھی ہو لیکن اگر ڈھنگ سے نہ کہی جائے گی تو اس کے پڑھنے والے یا سننے والے پر کوئی اثر نہ ہوگا۔'' [1]

گویا کسی بات کو صرف کہہ دینا ہی ناول کے لیے کافی نہیں بلکہ اس انداز میں کہنا لازمی ہوتا ہے جس سے بات میں اثر پیدا ہو۔مذکورہ ناول کا اسلوب بیان نہایت سادہ، سلیس اور آسان ہے۔ مصنفہ نے ناول میں تخلیقی اور معیاری زبان کا استعمال کیا ہے۔جس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ بھی موقع اور محل کے مطابق استعمال ہوئے ہیں جس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مصنفہ کو اردو زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل ہے۔اس سلسلے میں ناول سے لیا گیا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

'' دراصل سونا گاؤں ایک ایجنسی ایریا (Agency Area) یعنی قبائلیوں کے لیے مختص کیا گیا علاقہ تھا جو مال گزاری قوانین کی رو سے محفوظ ارضی یعنی (Reserved Land) تھا جو Prohobition of Land transfer Act 1959 کے تحت سرکاری ملکیت تھا اور

---

[1] اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، ص۸۹۔

قبائیلوں کے حق میں محفوظ تھا جسے نہ خریدا اور نہ بیچا جا سکتا تھا۔'' [1]

ایک اور جگہ دیکھئے:

''کبھی حوادث قدرتی Natural Clamities کی ستم ظریفیوں سے
نمٹنا۔غرض ڈیزاسٹر منیجمنٹ Disastar Managment کی ٹریننگ
نے مجھے سنگین صورت حال کا مقابلہ سکھا دیا تھا۔'' [2]

مذکورہ اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اِن انگریزی الفاظ کا اس لیے بھی استعمال کیا ہے کہ وہ محکمہ جنگلات سے متعلق اصطلاحات ہیں اور ایسی زبان کسی مخصوص طبقے یا پیشے میں استعمال کی جاتی ہیں جو کہ موضوع کا تقاضہ بھی معلوم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ناول میں ناول نگار نے نہایت ہی بلیغ اشاروں سے ناول کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے مگر انہیں سمجھنے میں قاری کو کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے۔مثال کے طور پر ناول میں ایک جگہ اس جملے کا استعمال کیا گیا ہے''دادی کا تخت خالی ہوگیا''تخت خالی ہونا ایک اشارہ ہے ایک سلطنت،ایک تہذیب کا مٹ جانا۔قمر جمالی کا تخلیقی ذہن جب کسی تجربے یا واردات کے اظہار پر آتا ہے تو بڑے خوش اسلوبی سے اس واردات کو قلم بند کرتی ہیں موقع اور محل کے اعتبار سے حسین اور دلکش تشبیہات واستعارات ،ضرب الامثال اور کہاوتیں پیش کرنا ان کے اسلوب زبان میں شامل

---

[1] ناول''آتش دان'' ۵۴۔

[2] ایضاً،ص۵۷۔

ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''ریشم سی ملائم دادی یک لخت سخت اور کھر دری ہوگئیں۔یہی تو
خصوصیت تھی دادی کی۔ وہ پیاری بھی اتنی ہی تھیں۔ گوری سی چھوٹی سی
روئی کے گالوں جیسی نرم، سفید براق سی صورت پر پان کی لالی اتنی کھبتی
کہ میں اکثر سوچا کرتا کہ دادی اس گھر میں کیسے آ گئیں۔۔۔۔۔'' ۱؎

تشبیہ کے سلسلے میں ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''دراصل اس رات کی ادھوری کہانی میرے دماغ کے پرتوں سے یوں
چپک گئی تھی جیسے ڈیپ فریزر Deep Freezer پر اگی خودساختہ برف
کبھی کبھی غفلت میں چھوجانے سے انگلیوں سے چپک جاتی ہیں'' ۲؎

اس ناول کے اسلوب میں نہ صرف تشبیہات کا حسن نظر آتا ہے بلکہ استعارے بھی بڑے عمدہ استعمال کئے گئے ہیں مثلاً دادی کی یاد کو انھوں نے جیتی جاگتی دادی اور دل کو یادوں کا قبرستان کہا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

''درد کب نا قابل تسخیر بن جاتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب
جیتی جاگتی دادی میرے دل کے نہاں خانے میں،
محفوظ رہ گئیں

۱؎ ناول ''آتش دان'' ص ۱۹۔

۲؎ ناول ''آتش دان'' ص ۲۷۔

ایک یاد بن کر۔ میرا دل۔۔۔۔۔۔۔دل نہیں

یادوں کا قبرستان ہے'' [1]

ایک اور جگہ دادی کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثال دیکھے:

''دادی ندی نہیں سمندر تھیں۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا انہیں سفید ساڑیوں اور سفید کرتے میں

ملبوس دیکھا۔

بے داغ صورت اور بے داغ لباس

دادی تو سرتاپا پاکیزگی کا مجسمہ تھیں

نہ ان کے اندر طوفان اٹھتا تھا،

اور نہ جھاگ کے باہر نکلنے سے فضا مسموم ہوتی تھی۔

ویسے دادی بھی تو انسان تھیں۔

اور انسان میں یہ کمزوریاں ہونی چاہیے کیوں کہ دادی خود کہتی تھیں انسان

میں کمزوریوں کا ہونا ہی بشریت کی علامت ہے۔

ہوسکتا ہے کہ دادی کے اندر بھی تلاطم تو ہوں۔

پر۔۔۔

ساحل پر موجوں کا ارتعاش میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

دادی۔۔۔۔!تم سمندر ہو'' [2]

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص۳۶/۳۷۔، [2] ناول ''آتش دان'' ص۲۱۔

قمر جمالی نے ناول میں محاوروں کا بھی بھر پور استعمال کیا ہے۔اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

''میں بڑی دیر سے بستر میں گھسا کُل بُل کر رہا تھا۔مگر دادی تھیں کہ آنے کا نام نہیں۔ پتا نہیں دادی اتنی مصروف کیوں رہتی ہیں۔'' ۱؎

''بیٹا ہم خاک نژاد ہیں اور خاک میں مل جانا ہی ہمارا مقدر ہے۔ پھر تو میں چراغ سحری ہوں اپنے دل پر رکھ مجھے کون سے قیامت کے بورئے سمیٹنے ہیں! بس ایک خواب چھپا بیٹھا تھا آنکھوں میں۔ ہر جنبش مژگاں کے ساتھ میں نے اس کی حفاظت کی۔'' ۲؎

''اب میرا غصہ سنبھل نہیں رہا تھا۔اس نو وارد کی دیدہ دلیری میری برداشت کے باہر تھی میں نے سوچا کہ اس گستاخی کے لیے اسے سبق سکھایا جائے میں غصے میں یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

صاحب! انسپکشن کرنا اتنا ضروری تھا۔۔۔۔۔۔۔تو ہم سے کہتے ارے کہہ کر تو دیکھتے۔۔۔۔۔! ہم جنگل میں منگل کروا دیتے۔ مٹی کی کوری ٹھیلیاں میں ٹھنڈا میٹھا شربت پیش کرتے ہیں۔ ۳؎

۱؎ ناول آتش دان، ص ۱۶۔

۲؎ ناول ''آتش دان'' ص۳۹۔،

۳؎ ایضاً ۷۶۔

مذکورہ اقتباسات سے جو محاورے ملتے ہیں وہ میں کل بل کرنا، خاک میں مل جانا، چراغ سحری ہونا، قیامت کے بورے سمیٹنا، آنکھوں میں چھپا ہونا، سبق سکھانا، جنگل میں منگل کرنا، دیدہ دلیر ہونا، تن بدن میں آگ لگنا وغیرہ محاوروں کو بڑی عمدگی سے استعمال کیا گیا ہے۔

ابتدائیہ میں مختصر لفظوں میں بہت کچھ سمویا ہوا ہے ناول کے بعض حصے نثری نظم کا مزا دیتے ہیں۔ یہ نظم ملاحظہ کیجیے:

گئو دھول۔
دھوپ ڈھلے
سانجھ آگے
اندھیروں کا نقیب
گئو دھول
ڈوبتی سورج کی کرنوں میں سر جھکائے،
دائیں بائیں ڈولتے، تھکے ہارے
مویشی
اور ان سے زیادہ تھکے ہوئے
ان کے گلے بان
آنکھوں میں شوق و اشتیاق
ایک امید
بھوکے پیٹ کی سیرابی کی توقع

اور دوسرے دن کے اگنے کی امید۔ [1]

اسلوب کی شگفتگی کا اندازہ درج ذیل فقرے سے ہوتا ہے۔

''سرکار۔۔۔۔۔!دل کو اتنا بھی بڑا نہیں ہونا چاہیے کہ سینے کا صندوق چھوٹا پڑے۔'' [2]

قمر جمالی کی زبان پر مضبوط گرفت ہے۔مذکورہ ناول میں کئی جگہ ایسے موڑ آئے جہاں مصنفہ اگر احتیاط سے کام نہ لیتیں تو کلائیمکس کھل جاتا اور وہاں کہانی کا دم نکل جاتا۔کمال یہ ہے کہ ناول نگار ایسے ہر موڑ سے بچ کر نکل گیئں۔پورے ناول میں تجسس برقرار رہتا ہے۔کسی بھی کہانی کی یہ خوبی ہے اور یہی خوبی قاری کو کلائمکس تک لے جاتی ہے۔

مجموعی طور پر زبان و بیان پر قمر جمالی کو بے پناہ مہارت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے جگہ جگہ کہاوتوں،ضرب الامثال،محاوروں اور تشبیہات کی بہتات نظر آتی ہے قمر جمالی کا یہ ناول زبان و بیان کے اعتبار سے ایک خاص معیار کا حامل ہے۔انھوں نے اس ناول کو پیش کرنے کے لیے سادہ اور عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔جس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ بھی موقع و محل کے مطابق استعمال ہوئے ہیں۔ان انگریزی الفاظ کی وجہ سے ناول کے لطف میں اضافہ بھی ہوجاتا ہے۔علاوہ ازیں یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ مصنفہ کو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی پر بھی قدرت حاصل ہے۔

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۸۱/۸۰۔

[2] ناول ''آتش دان'' ص۱۰۹۔

فن یا تکنیک:

ناول کچھ فنی اصولوں پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ ہر باسلیقہ نال نگار قصہ کے بیان کرنے میں یا کردار کے ظاہر کرنے میں کسی خاص تکنیک سے کام لیتا ہے۔ ہر بڑے ناول میں اخلاق کے علاوہ تشکیل (form)اور طرز ادا میں ہم آہنگی بھی ہوتی ہے یعنی پلاٹ کی ترتیب میں ایک خوش نما کردار کو ظاہر کرنے کا ایک دلچسپ طریقہ استعمال ہوتا ہے،اچھے ناول کے مختلف حصوں میں وہ ہم آہنگی ہوتی ہے جو عام طور پر زندگی میں نہیں ملتی اس طرح ہر فن پارے کی طرح ناول بھی زندگی سے مختلف ہوتا ہے۔لیکن اس فنی آہنگ کو پیدا کرنے کے لئے ہر ناول نگار اپنا الگ طریقہ استعمال کرتا ہے اور واقعات وکردار کی ترتیب خاص اصول کے تحت لاتا ہے۔بعض ناول نگار اس فنی آہنگ کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اور کچھ کم جو ضرورت سے زیادہ انہماک دکھاتے ہیں ان کے فن میں آورد وتصنع پیدا ہوتا ہے۔

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اب تک تکنیک کی سطح پر بہت سارے تجربے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈائری کی تکنیک ،سوانحی تکنیک ،فلیش بیک،شعور کی رواور بیانیہ تکنیک میں لکھے ہوئے ناول موجود ہیں۔اکثر ناول نگاروں نے بیانیہ تکنیک میں ہی ناول لکھے ہیں جس میں کہیں کہیں ڈرامائی پیش کش اور دوسری تکنیک کا بھی استعمال کیا گیا۔

’’آتش دان‘‘ میں تکنیک کی سطح پر کوئی نیا تجربہ نہیں کیا گیا ہے۔روایتی تکنیک میں ہی ناول کو پیش کیا گیا ہے۔ناول نگار نے زیادہ تر بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے اور کہیں کہیں فلیش بیک کی تکنیک اور ڈرامائی پیش کش سے قصے کو آگے بڑھایا۔مثال کے طور پر ناول سے لیا گیا یہ اقتباس فلیش

بیک تکنیک کی غمازی کرتا ہے:

''ایک وہ زمانہ تھا جب،
سردیوں کی راتیں طلسماتی ہوا کرتیں۔
شام کے ساتھ ہی آتش دان گرم ہوتے، کمروں میں سرِ شام عود، لوبان
کی دھونی، رمائی جاتی۔ بعد نماز عشا سب مل کر کھنا کھاتے،
پھر۔۔۔۔صدر دالان میں گھر کے تمام افراد جمع ہوتے۔
چائے کے دور چلتے۔
نمکین اور مٹھائی اڑائی جاتی۔
خاندان کے تمام افراد ایک دوسرے کے احوال پوچھتے جو حاضر ہے ان
سے باتیں ہوتیں اور جو غائب ہیں؟
ان کا ذکر خیر ہوتا۔
اور آخر میں تان جا کر ٹوٹتی۔۔۔۔۔
کہانیوں پر۔
گھر کے بڑے اپنے اپنے کاموں پر لگ جاتے اور بچے۔۔۔۔۔؟
بزرگوں کے گرد جمع ہو جاتے۔
مگر اب۔۔۔۔
یہ سب تو۔۔۔۔خوبوں کی باتیں ہوگئیں۔ [1]

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص۱۲/۱۳۔

قمر جمالی کا ناول ''آتش دان'' فنی نقطہ نظر سے اپنی مثال آپ ہے۔انھوں نے اس ناول میں اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں ناول کے جو بنیادی عنصر ہونے چاہیے قمر جمالی نے ان تمام لوازمات کو اس ناول میں برتا ہے۔زبان و بیان ہو یا تکنیک ناول پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی فن کارانہ چابک دستی سے کام لیا ہے۔کہانی میں ایک جگہ ایسا موڑ آتا ہے جب شہباز خان کو ان تمام سوالات کے جوابات خود بخود مل جاتے ہیں جو انھوں نے وقت پر چھوڑے تھے اور وہیں سے اصل قصے کی شروعات ہو جاتی ہے۔ جہاں سے اصل قصہ شروع ہوتا ہے وہاں سے کہانی بیانیہ انداز اختیار کر لیتی ہے۔کہانی ابتدا، وسط اور اختتام کی منزلوں سے گزر کر قاری کے دل پر ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہے قمر جمالی نے اس ناول میں کہیں کہیں خود کلامی کی تکنیک کے ذریعے بھی ناول کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

''ایک طرف۔۔۔۔۔میرا مقصد۔۔۔۔۔۔سورج پور کی مظلوم رعایا،
دوسری طرف۔۔۔۔۔۔سیاسی بالا دستیاں ،حالات کہہ رہے تھے کہ
بھاگ نکلو یہاں سے۔مزید برآں کہ میر مدار کے دہشت بھرے قصے کہ
کیسے ریڈی برادران نے ظلم کی انتہا کر دی۔میں شاید اندر ہی اندر بہت
خوف زدہ تھا۔ڈر گیا تھا میں، کمزور پڑ گیا تھا۔[1]

---

[1] ناول ''آتش دان'' ص ۸۴۔

فلسفہ حیات:

اللہ تعلیٰ نے انسانیت کو سماجیات، سیاست، اقتصادیات اور دیگر اجزا میں تقسیم کیا ہے اور انسان پر سب سے زیادہ اثر سماجیات کا ہے۔ دیگر لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی سماج میں ایک فرد اور رکن کی حیثیت ہوتی ہے۔ سماج میں ہی اس کی خمیر تیار ہوتی ہے اور اسی میں دفن بھی۔ سماج کا سب سے حساس اور ذہین فرد تخلیق کار ہوتا ہے اور یہ تخلیق کار سماج کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور جو بھی تخلیق کرتا ہے کسی ٹھوس مقصدیت کے تحت تخلیق کرتا ہے۔

فلسفۂ حیات کے بغیر کوئی بھی فن پارہ ادھورا اور بے روح سمجھا جاتا ہے۔ ادیب فلسفۂ حیات سے فن پاروں میں معنویت پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم ناول کی بات کریں تو ناول کے کرداروں کے عمل اور ردعمل سے مصنفہ کے نقطہ نظر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو کبھی تو ہمدردانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور بعض کرداروں کے ساتھ ہمدردانہ نہیں کرتا بلکہ کہیں کہیں تو ان کے ساتھ نفرت کا برملا اظہار کرتا ہے۔ کہیں وہ شوخیانہ اشاروں سے کام لیتا ہے اور ہے۔ کہیں طنز کے حربے آزماتا ہے۔ پھر بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کے ساتھ ساتھ ان میں پیدا ہونے والی خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیوں کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ بقول احسن فاروقی:

> ''فلسفۂ حیات کی بھی ناول میں کافی اہمیت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ناول نگار کوئی فلسفہ یا اخلاقی سبق اپنے ناول کے ذریعے ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہو مگر چونکہ ناول نگار کا مطمح نظر زندگی کو پیش کرنا ہے۔ لہذٰ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی تصویر زندگی اس کے عام اخلاقی و فلسفی

ومذہبی وغیرہ خیالات کی حامل نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ناول کے قصے میں کوئی خاص نظریہ مضمر نہ ہو مگر پھر بھی ناول نگار زندگی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ بعض چیزوں کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ اس لئے اس کے ناول میں ہم کو فلسفۂ حیات کی بابت کچھ نہ کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ ہر ناول ایک فلسفۂ حیات کا عکس پیش کرتا ہے خواہ وہ عکس کتنا دھندلا کیوں نہ ہو زندگی کے کچھ پہلوؤں کو روشن کرتا ہے اور بعض پہلوؤں کو کچھ تاریکی میں ڈال دیتا ہے''۔ [1]

ہر انسان کی طرح فن کار کے بھی اپنے Values اور Dimenssions ہوتے ہیں جن کو وہ مدنظر رکھ کر آگے کی زندگی بحسن وخوبی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی فن کار دنیا کو نفسیاتی نظریہ سے مشاہدہ کر کے پیش کرتا ہے اور کوئی تخلیق کار جمالیاتی نقطہ نظر سے اس دنیا کو دیکھ کر اس کا مظاہرہ اپنے فن پاروں میں کرتا ہے یا پھر کوئی سماج سے جڑے ہوئے مسائل کو اپنے فن پاروں کے ذریعے قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ غرض ہر کسی کا اپنا الگ الگ نظریۂ حیات ہوتا ہے اور جب وہ اس کے مطابق اپنے زندگی کے اصول متعین کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کا خاکہ تشکیل دیتا ہے تو وہی اس کا فلسفۂ حیات کہلاتا ہے۔

قمر جمالی نے اس وقت مارکسی نظریہ کو احیائے نو بخشا جب ہمارا اردو ادب نئے نظریات کے

---

[1] محمد احسن فاروقی، سید نورالحسن ہاشمی، ناول کیا ہے؟، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۴۶/۴۵۔

دھندلکوں میں کہیں گم ہو گیا تھا اور حقیقت نگاری کے بجائے غیر منکشف چیزوں پر زور دیا جاتا تھا۔قمر جمالی کا ناول ''آتش دان'' اسی فلسفۂ حیات کی ایک عمدہ مثال ہے جس میں زندگی کی پیچیدگیوں کو پیش کیا گیا ہے۔''آتش دان'' میں بھی وہی کشمکش اور وہی مزدوروں کے مسائل کا مظاہرہ ملتا ہے جو آج سے پانچ سات دہائیوں پہلے صفحۂ ادب پر رقصاں ملتے تھے۔''آتش دان'' اسی ادب کی بازگشت معلوم ہوتا ہے۔

زمان ومکان:

ناول میں وقت کے ساتھ ساتھ مقام کا تعلق بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ناول نگار اپنے قصے اور پلاٹ کی بنیاد عام طور پر ایک مخصوص دور اور ایک خاص مقام سے تعلق رکھنے والے واقعات اور افراد پر اٹھاتا ہے۔افراد کے کردار پر وقت اور مقام دونوں اثر انداز ہوتے ہیں۔علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

> ''قصہ کے لئے اس کا تعین ضروری ہے کہ کہاں ہوا اور کب ہوا۔جس طرح مقامات کے بدلنے سے افعال وحرکات بدل جاتے ہیں اسی طرح زمانی اور وقت کے تغیر سے بھی ان میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔''[1]

زندگی ہر دور میں بدلتی رہتی ہے۔تہذیبیں بنتی بگڑتی ہیں۔ہر انسان کے روز وشب تغیر کے زد میں آتے رہتے ہیں۔علاوہ ازیں جغرافیائی حدود بھی کردار و واقعات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔مختلف

---

[1] علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص ۶۵۔

علاقوں کے باشندوں کی سیرت میں فرق ہوتا ہے۔اسی بنا پر ان کے رسم ورواج اور طرز و بودو باش میں اختلاف ہوتا ہے۔ ناول نگار ایک خاص دور کی تصویر کشی کرتے وقت اس عہد کے رسم ورواج اور طرز معاشرت پر گہری نظر رکھتا ہے۔

قمر جمالی کا ناول بھی ایک مخصوص دور کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول کے پس منظر میں ایک نظریاتی کشمکش کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ دیکھا جائے تو ناول ترقی پسند نظرئے کی تقلید کرتا ہوا نظر آتا ہے۔جس میں ایک خاص طبقے کی کشمکش کو ایک قصہ کی شکل میں پرو دیا گیا ہے۔ ناول میں ایک خاص اندازفکر کو سمویا گیا ہے اور یہی اندازفکر اس ناول کو اشترا کی زمرے میں ضم کرتا ہے۔

غرض کہ'' آتش دان'' میں جا گیر دارانہ ماحول اور معاشرت، سیاسی اور سماجی صورت حال سے وابستہ تمام واقعات وحادثات کو بیانیہ تکنیک کے قالب میں ڈھالا گیا ہے اور اس کی پیش کش میں قمر جمالی نے اپنے تجربے، مشاہدے اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کام لیا ہے۔'' آتش دان'' میں جا گیر دارانہ ظلم و جبر، اعلیٰ افسر شاہی، معاشرتی نظام اور سیاسی اور سماجی حال کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔ پلاٹ کے اعتبار سے بھی یہ ناول اہم ہے۔ ناول کا پلاٹ سیدھا سادا اور منظّم ہے، واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ قاری کا تاثر شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ کہانی میں تجسس اور دلچسپی بھی آخر تک قائم رہتی ہے۔ اسی طرح ناول میں کردار نگاری بھی بڑی عمدگی سے کی گئی ہے۔ ناول میں ہمیں جیتے جاگتے، زندہ اور متحرک کردار ملتے ہیں۔ مثبت کرداروں میں شہباز کا کردار جاندار اور متحرک نظر آتا ہے، جو آگے بڑھنے اور دوسروں کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ شروع سے آخر تک کرداروں کو عمل کرتے دکھایا گیا، ساتھ ہی حالات سے مقابلہ کرنا اور

ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے دکھایا گیا ہے۔

قمر جمالی نے مکالمہ نگاری میں بھی اپنی فن کاری کا اچھا مظاہرہ کیا ہے اور ہر کردار کی زبان سے ایسے مکالمے ادا کروائے ہیں جو بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔قمر جمالی کو بچوں کی نفسیات سے پوری واقفیت حاصل ہے۔انھوں نے شہباز اور دادی کے مکالموں کے ذریعہ ان کے خیالات اور جذبات کی اچھی ترجمانی کی ہے،شہباز کے کردار کے ذریعہ انھوں نے بچوں کی نفسیات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔قمر جمالی نے منظر نگاری کے بھی بہترین نمونے اس ناول پیش کیے ہیں۔انھوں نے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو قصے سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔

مذکورہ ناول کا اسلوب بیان نہایت سلیس،سادہ اور آسان ہے۔مصنفہ نے ناول میں تخلیقی اور معیاری زبان کا استعمال کیا ہے۔جس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ بھی موقع اور محل کے مطابق استعمال ہوئے ہیں۔حسین اور دلکش تشبیہات واستعارات،ضرب الامثال،کہاوتیں اس ناول میں بڑی عمدگی سے پیش کیے گے ہیں۔قمر جمالی کا ناول ''آتش دان'' فنی نقطہ نظر سے کامیاب ناول ہے۔انھوں نے اس ناول میں اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں ناول کے جو بنیادی عنصر ہونے چاہیے قمر جمالی نے ان تمام لوازمات کو اس ناول میں برتا ہے۔زبان وبیان ہو یا تکنیک ناول پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی فن کارانہ چابک دستی سے کام لیا ہے۔موضوعات ومسائل کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی وجہ سے قاری کو پڑھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔''آتش دان'' بلاشبہ عصر حاضر کا ایک اہم ناول ہے،جو قمر جمالی کی تخلیقی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے۔

﴿ماحصل﴾

ماحصل

سرزمین حیدرآباد اپنی بیش بہا خصوصیات کی بنا پر اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ابتداء ہی سے یہ شہر اپنی منفرد زبان،تہذیب اور ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی سرزمین اردو ادب کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ریاستی سطح پر خواتین ناول نگاروں کی موجودگی کا احساس لگ بھگ انیسویں صدی کے اوائل میں ہوتا ہے۔ جہاں کئی خواتین اپنی کاوشوں سے ناول کے کینوس پر رنگ بکھرتی نظر آتی ہیں جن میں جیلانی بانو،عفت موہانی، آمنہ ابوالحسن، رفیعہ منظورالامین،قمر جمالی وغیرہ نے اپنی کاوشوں سے اردو نثر کو آگے لے جانے میں کوئی کثر نہیں چھوڑی۔

قمر جمالی دکن کی ایک مقبول و معروف شخصیت تصور کی جاتی ہے،جن کا تعارف نہ صرف ادبی حلقوں تک مسدود ہیں بلکہ ان کی شخصیت امراء و شرفاء کے علاوہ بستی بستی قریہ قریہ تک رسائی حاصل کر چکی ہے۔موصوفہ کی شخصیت اپنے گونا گوں صفات اور مختلف الجہات اہلیتوں کی آئینہ دار ہیں۔جس کی وجہ سے ان کا نام ہر خواص وعوام کی زبان پر ہے۔قمر جمالی ایک اچھی فکشن نگار ہونے کے علاوہ ایک منکسرالمزاج اور محنتی خاتون بھی ہیں۔ایک خاص تشخص ہونے کے باوجود ان کی شخصیت میں تکبر،تصنع اور بناوٹ کے بجائے سادگی ہے جو ان کے پہناوے، بات چیت اور انداز و اطوار سے صاف جھلکتا ہے۔ وہ نہایت خوش مزاج ،نیک سیرت ،بلند خیال اور سنجیدہ خاتون ہیں۔طبیعت میں توازن،نرمی اور ہمدردی ہے۔ان کے اخلاق و عادات متاثر کن ہیں،ان کے مزاج میں تلخی نہیں اور ان کو مشرقی اقدار کی پاس داری کا بھی لحاظ ہے۔ ہر کسی سے خلوص و محبت کے ساتھ پیش

آتی ہیں۔اپنے بزرگوں کا ادب واحترام چھوٹوں سے محبت وشفیق برتاؤاور دوست واحباب کے ساتھ مخلصانہ وہمدردانہ رویہ رکھتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سبھی ان سے محبت کرتے ہیں اوران کا احترام بھی کرتے ہیں۔قمر کی شخصیت کا سب سے لائق تحسین اور غالب پہلو یہ ہے کہ ان کے ظاہراور باطن میں کوئی تفریق نہیں پائی جاتی ہے۔

قمر جمالی کا ادبی حلقہ بہت وسیع ہے۔ان کی علمیت اور قابلیت کی بنا پر ہر انجمن اور محفل میں ان کے نہ صرف چہیتے بلکہ ان کے اپنے معتقد بھی وسیع تر پیمانے پر نظر آتے ہیں۔وہ کئی ادبی اداروں اور انجمنوں سے وابستہ ہیں۔قمر جمالی نے آج تک ادبی دنیا کے لئے بہت سے کارنامے انجام دیے ہیں۔ان کے کارناموں میں جہداور جگر کاوی کے ان مٹ نقوش آج بھی ادبی دنیا کے کتبے پر آبِ زر سے کندہ ہیں۔ان کی اس کوشش اور سخت محنت کے صلہ میں انہوں نے بہت سے انعامات واعزازات حاصل کیے ہیں،جس سے ان کی ادبی شخصیت کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔علاوہ ازیں قمر جمالی کی شخصیت میں سب سے بڑی بات جوان کی شخصیت کی طرف راغب کرتی ہے،وہ یہ ہے کہ جہاں انہوں نے فکشن میں ناموری حاصل کی وہیں انہوں نے تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود بھی اپنے عہدے کے تئیں انصاف کیا اور وہاں بھی مختلف انعامات واعزازات سے نوازی گئیں۔

قمر جمالی کو زمانہ طالب علمی ہی سے پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔قمر زیادہ تر انگریزی ادب کا مطالعہ کرتی تھیں۔جس کے باعث ان کے خیالات وافکار میں کافی وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہوا۔ انگریزی ادب کے مطالعے کے باعث ان کے اسلوب میں جدت طرازی کا حسن پیدا ہوا۔انجمن ترقی

پسند مصنفین سے منسلک ہونے کے سبب قمر کی شخصیت اور فن پر اسکا اثر بھی رونما ہوا۔قمر جمالی کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ''اے چاند چھپ نہ جانا'' سے ہوا جو ایک عشقیہ موضوع پر مبنی کہانی ہے جو ایک ہفتہ وار اخبار ''رسالہ روداد حیات'' دہلی میں ۱۹۶۶ء میں چھپا تھا۔اس وقت قمر جمالی کی عمر ۱۴ سال تھی۔اس کے بعد ان کی دوسری کہانی ''فاصلے مٹ گئے'' ۱۹۶۹ء میں رسالہ ''بیسوی صدی'' میں دہلی سے شائع ہوئی۔پھر ان کے قلم میں توانائی آئی اور وہ افسانہ نگاری کی طرف باقاعدگی سے توجہ دینے لگیں۔ہندوستان کے تمام معتبر اور معروف رسائل کے علاوہ پاکستان کے رسالہ بادبان، سخنور، منشور میں ان کی کہانیاں شائع ہوکر ان کے نام کی مہر ثبت کی ہے۔

قمر جمالی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔لیکن قمر جمالی ان تخلیق کاروں میں گردانی جاسکتی ہیں جنہوں نے ناول اور افسانہ دونوں کے تئیں حق ادا کیا ہے۔قمر جمالی نے ''آتش دان'' لکھ کر اپنی تخلیقیت اور فنی بصیرت کا مسلّم ثبوت ادبی دنیا کو فراہم کیا ہے۔ان کے ناول ''آتش دان'' میں تقریباً تمام خوبیاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔'آتش دان' نہایت ہی سہل اور آسان زبان میں لکھا گیا ہے جس میں وقت کے فلسفے کو ایک لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اشاروں کنایوں میں زندگی کے فلسفے کو سمجھایا گیا ہے۔قمر جمالی کا یہ پہلا ناول ہے۔اب تک انہوں نے صرف افسانوی ادب تخلیق کیا ہے۔اصولی طور پر اس ناول میں افسانوی رنگ زیادہ ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔انہوں نے اس میں ایک نئے موضوع کو جگہ دی ہے۔گاؤں کے کسانوں کی مظلومیت اور انانیت اور سیاسی سہارے کی غندہ گردی، دولت اور قبیلے کے بل بوتے پر ڈکٹیٹر شپ کی چکی میں پسے ہوئے عام انسان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ناول نگار نے ایک چھوٹے سے دیہات کے ذریعہ ہندوستان کی سماجی، سیاسی

اور معاشی زندگی کو پیش کیا ہے۔قمر جمالی نے ناول'' آتش دان'' کے ذریعہ یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جدید ہندوستان میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی جگہ سیاسی لیڈروں نے لے لی ہے۔'' آتش دان'' زندگی کے رزمیہ ہی کو پیش نہیں کرتا بلکہ رزمیہ کے ساتھ ایک نظریہ اور فلسفہ کو بھی پیش کرتا ہے۔ یہ ناول ایک مزدور کے روزمرہ اور اس کی عام زندگی جو اسی کشمکش میں گزر جاتی ہے کہ کب اس کا نفس روٹی کے ٹکڑے سے سیر ہو جائے۔

پلاٹ کے اعتبار سے بھی یہ ناول اہم ہے۔ناول کا پلاٹ سیدھا سادا اور منظّم ہے، واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ قاری کا تاثر شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔کہانی میں تجسس اور دلچسپی بھی آخر تک قائم رہتی ہے۔اسی طرح ناول میں کردار نگاری بھی بڑی عمدگی سے کی گئی ہے۔ناول میں ہمیں جیتے جاگتے، زندہ اور متحرک کردار ملتے ہیں۔

قمر جمالی نے مکالمہ نگاری میں بھی اپنی فن کاری کا اچھا مظاہرہ کیا ہے اور ہر کردار کی زبان سے ایسے مکالمے ادا کروائے ہیں جو بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔منظر نگاری کے بھی بہترین نمونے اس ناول پیش کیے ہیں۔انھوں نے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو قصے سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ناول'' آتش دان'' کا اسلوب بیان نہایت سلیس، سادہ اور آسان ہے۔مصنفہ نے ناول میں تخلیقی اور معیاری زبان کا استعمال کیا ہے۔جس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ بھی موقع اور محل کے مطابق استعمال ہوئے ہیں۔حسین اور دلکش تشبیہات و استعارات، ضرب الامثال، کہاوتیں اس ناول میں بڑی عمدگی سے پیش کیے گے ہیں۔قمر جمالی کا ناول'' آتش دان'' فنی نقطہ نظر سے کامیاب ناول ہے۔انھوں نے اس ناول میں اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی

ہے۔زبان وبیان ہو یاتکنیک ناول پڑھنے کے بعداس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ انھوں نے بڑی فن کارانہ چابک دستی سے کام لیا ہے۔موضوعات ومسائل کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی وجہ سے یہ ناول قاری کو پڑھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔قمر جمالی نے اس وقت مارکسی نظریہ کواحیائے نو بخشا جب ہمارا اردو ادب نئے نظریات کے دھندلکوں میں کہیں گم ہوگیا تھا اورحقیقت نگاری کے بجائے غیر منکشف چیزوں پر زور دیا جاتا تھا۔قمر جمالی کا ناول ''آتش دان'' اسی فلسفۂ حیات کی ایک عمدہ مثال ہے۔جس میں زندگی کی پیچیدگیوں کو پیش کیا گیا ہے۔شمس الرحمان فاروقی نے ''آتش دان'' کے بارے میں اپنے رویّہ کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے:

> ''موضوع کے اعتبار سے یہ مجھے بالکل نیا ناول معلوم ہوا۔گاؤں کے کسانوں کی مظلومیت،مقامی غنڈہ گردی اور سیاست اورحکومت کے جوڑتوڑ کوخوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ناول کا پلاٹ اگرچہ مربوط ہےمگر بیان کی کمزوری،مکالموں کی تکرار اور مناظر کی یک رنگی اس کے فطری بہاو میں خارج ہوتے ہیں۔لفظ گیٹ کوانہوں نے ہرجگہ مونث لکھا ہے بہتر ہے کہ انہیں اگلی اشاعت میں درست کرلیا جائے۔ان باتوں کونظر انداز کردیں تو ناول اچھا ہے اور دلچسپ یقیناً ہے۔بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایک نئے موضوع کوفکشن کے حیطے میں لاتا ہے۔'' [۱]

مجموعی طور پرقمر جمالی ایک ایسی نسائی آواز ہے جواپنی تحریروں کی وساطت سے اردو دنیا میں

---

[۱] شب خون خبر نامہ،جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء،ص ۲۴

اپنی پہچان بنانے میں کامیاب نظرآتی ہیں۔ان کے فن پاروں کی زبان نہایت شستہ اور معیاری ہے۔ وہ الفاظ کو نگینوں کی صورت جڑنا جانتی ہیں۔ان کا ذوقِ جمال ان کے ناول ''آتش دان'' میں نکھر کر سامنے آیا ہے۔''آتش دان'' میں جاگیردارانہ ظلم وجبر،اعلیٰ افسر شاہی،معاشرتی نظام اور سیاسی اور سماجی حال کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔انھوں نے اپنے ناول میں پیچیدہ لب و لہجے سے گریز کیا ہے۔انھوں نے اپنے ناول میں کہیں کہیں تلگو اور انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو ناول کے اسلوب میں چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے جملے یا فقرے ایک صوتی آہنگ پیدا کر دیتے ہیں۔کہانی میں ان کا لب ولہجہ سادہ اور سپاٹ ہے۔انھوں نے تمام واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے تمام اسرار ورموز کی مضبوط گرہیں کھولنے کی سعی میں اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔''آتش دان'' بلاشبہ عصر حاضر کا ایک اہم ناول ہے،جو قمر جمالی کی تخلیقی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے۔

﴿کتابیات﴾

کتابیات

مصنفہ کی تصانیف

نمبر شمار	کتاب کا نام	پبلیشر	سنہ اشاعت
۱	شبیہ	خورشید پریس، چھتہ بازار حیدر آباد	۱۹۹۱ء
۲	سبوچہ	تناظر پبلیکیشنز، دہلی	۱۹۹۲ء
۳	سنگریزے	تناظر پبلیکیشنز حیدر آباد	۱۹۹۳ء
۴	سحاب	ایضاً	۲۰۰۱ء
۵	زہاب	حسامی بک ڈپو مچھلی کمان، چار مینار، حیدر آباد	۲۰۰۷ء
۶	انعکاس	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی	۲۰۱۴ء
۷	صحرا بکف	ایضاً	۲۰۱۵ء
۸	آتش دان	ایضاً	۲۰۱۵ء

دیگر تصانیف

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	پبلیشر و سنہ اشاعت
۱	احسن فاروقی و نورالحسن ہاشمی	ناول کیا ہے؟	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء
۲	اختر اورینوی	تحقیق و تنقید	شاد بک ڈیپو، پٹنہ، ۱۹۶۳ء
۳	اطہر پرویز	ادب کا مطالعہ	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء
۴	انور پاشا، ڈاکٹر	ترقی پسند اردو ناول	پیش ور پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء
۵	انور پاشا، ڈاکٹر	ہندو پاک میں اردو ناول	شارب پبلیشیرز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء
۶	رفعیہ سلطانہ	اردو ادب کی ترقی میں خواتین	مجلس تحقیقات اردو حمایت نگر
۷	خلیل الرحمٰن اعظمی	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ایجوکیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۷۹ء
۸	سلام سندیلوی	ادب کا تنقیدی مطالعہ	نسیم بک ڈیپو، لکھنو، ۱۹۸۴ء
۹	سید جاوید اختر	اردو کی ناول نگار خواتین	بسما کتاب گھر، دہلی، ۲۰۰۲ء
۱۰	سید محمد عقیل	جدید ناول کا فن	نیا سفر پبلیکیشنز، آلہ اباد، ۱۹۷۷ء
۱۱	سیفی سرونجی، ڈاکٹر	اکیسویں صدی میں اردو ناول	انتساب پبلیکیشنز، ایم۔ پی، ۲۰۱۵ء
۱۲	صبا عارف، ڈاکٹر	اردو میں ناولٹ نگاری	موڈرن پبلیشنگ ہاوس نئی دہلی، ۲۰۰۲ء
۱۳	علی عباس حسینی	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء

۱۴	قمر رئیس و خلیق انجم	اصناف ادب	سر سید بک ڈیپو، علی گڑھ، ۱۹۸۵ء
۱۵	مجید بیدار، ڈاکٹر	ناول و متعلقات ناول	نیشنل پرنٹنگ پریس، حیدر آباد ۱۹۸۹ء
۱۶	مشرف علی	جیلانی بانو کی ناول نگاری	
۱۷	نجم النساء	آزادی کے بعد حیدر آباد کی نثر نگار خواتین	
۱۸	وقار عظیم	داستان سے افسانے تک	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء

اخبارات ورسائل

نمبر شمار	نام اخبار ورسائل	مقام اشاعت	ماہ وسال
۱	تناظر	دہلی	نومبر ۱۹۹۲ء
۲	سب رس	حیدرآباد	اگست ۲۰۱۴ء
۳	سب رس	حیدرآباد	دسمبر ۲۰۱۴ء
۴	شاعر	بمبئی	ستمبر ۲۰۰۷ء
۵	شاعر	بمبئی	مارچ ۲۰۱۵ء
۶	شب خون، خبر نامہ		جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء

انٹرویو

۱۔قمر جمالی، شخصی انٹرویو، ۳ جنوری ۲۰۱۶ بروز اتوار دوپہر ۲:۳۰ بجے۔

۲۔ایضاً ۱۱/اپریل بروز پیر شام ۵:۴۵ بجے۔

۳۔محمود حامد صاحب، شخصی انٹرویو، ۱۱/اپریل بروز پیر شام ۵:۴۵ بجے۔

۴۔نورالحسنین، شخصی انٹرویو، ۱۵/اپریل بروز سنیچر شام ۶ بجے بمقام ہومینیٹز بلاک یونیورسٹی آف حیدرآباد۔